خواجہ حسن نظامی کی ایک آنہ اردو یونیورسٹی کی کتاب

تاریخ انقلاب دہلی
کا گیارہواں حصہ

دہلی کی آخری شمع

یعنے بلبل ہزار داستان ادیب الملک میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا لکھا ہوا دہلی کا آخری مشاعرہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء میں پانچویں بار خواجہ حسن نظامی دہلوی نے اپنے اہل بیت پریس اردو بازار دہلی میں چھاپ کر شائع کیا

قیمت ایک روپیہ

پتہ:- منتظم دفتر لوح محفوظ اردو لائبریری دہلی

۷۸۶ ہوالکل یاحسین

غدر دہلی کے افسانوں کا
گیارھواں حصہ
دہلی کی آخری شمع
طبع اوّل کا دیباچہ

نوشتہ خواجہ حسن نظامی دہلوی

سدا رہے نام اللہ کا۔ دنیا کے طلسم خانے میں کون رہا ہے جو دلّی کی شان رہ جاتی اور کون جانتا ہے کہ دلّی اُجڑنے کے بعد لندن کی آبادی نمودار ہوئی تو یہ آبادی کب تک قائم رہے گی۔ اور کونسا انگریز حسن نظامی کی طرح ٹیمز دریا کے کنارے بیٹھ کر لندن کی ختم شدہ شان کے افسانے لکھا کرے گا۔

میں نے دہلی کی بربادیاں دیکھیں۔ آبادیاں دیکھنے کا وقت نہ ملا کہ میری پیدائش سے برسوں پہلے ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے ماں باپ نے اور نانا نانی نے بادشاہ اور اُن کے خاندان کو اپنے گھر میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ اور قلعہ میں مہمان بن کر مغلوں کی آخری بہار کی سیر کی تھی۔ اور پھر انھوں نے ان سب کا بگڑنا اور بکھرنا اور دربدر خاک بسر ہونا بھی دیکھا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو رات دن یہی غمگین کرنے والی کہانیاں سنیں اور دل پر ان کہانیوں نے ایسے نقش کئے کہ آج اکیاون سال کی عمر میں بھی وہ باتیں کانوں میں گونجا کرتی ہیں

لکھنے کا زمانہ آیا تو دل کے اثرات نے سب سے زیادہ دہلی اور غدر ۱۸۵۷ء کے حالات پر متوجہ رکھا۔ پہلا مضمون بہادر شاہ کے خاندان کی نسبت چھپا تو ملک میں دھوم مچ گئی۔ میں سمجھا یہ میدان لکھنے کے لئے ایسا ہی عمدہ ہے جیسا شاعری کے لئے تصوف سب سے اچھا میدان ہے۔

پھر تو ایک کتاب شائع ہو گئی اور لوگوں نے انگریز سرکار کو اس کے خلاف بدگمان بھی کرنا چاہا۔ مگر سرکار نیت کو دیکھتی تھی کہ میں عبرت کی تاریخ لکھتا ہوں۔ انقلاب کے مقصد سے میرا کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

پھر اس سلسلہ کا دوسرا، تیسرا یہاں تک کہ دسواں حصّہ بھی شائع ہو گیا۔ اب میں نے خیال کیا کہ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ اس کے بعد کچھ باقی نہیں ہے جس کو لکھوں۔ ہاں شاہی خاندان کے کسی فرد کا کوئی حصّہ مل جاتا تو اس کو نمک مرچ لگا کر کسی رسالہ میں چھپوا دیتا تھا۔

یکایک جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی رجسٹرار ہائیکورٹ حیدرآباد کا ایک مضمون دہلی کے ایک مشاعرے کی نسبت نظر آیا جو رسالہ اردو اور رسالہ الناظر اور کتاب مضامینِ فرحت میں شائع ہوا تھا۔

وہ مضمون میرے دوست مُلّا واحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ دہلی نے سب سے پہلے دیکھا اور چونکہ اُن کا خاندان شاہجہاں بادشاہ کے زمانے سے دہلی میں ہے اور اس کے تعلقات قلعہ سے ہمیشہ رہے تھے اس لئے ان پر دہلی کے اس مشاعرے نے بڑا اثر کیا۔ اور میں نے اُن کے کہنے سے تمام و کمال مضمون پڑھا۔ حالانکہ میں آج کل کام کی کثرت کے سبب اکثر مضامین کے مطالعے سے محروم رہتا ہوں۔

جب میں نے اس کو پڑھا تو فوراً انگریزی اخبار رئیگ مسلم کے ایڈیٹر صاحب سے

کہا کہ اس مضمون کا ترجمہ کیجئے۔ تاکہ یورپ و امریکہ کو بھی دہلی کی آخری شمع کی روشنی نظر آسکے۔

اس کے بعد میں نے مرزا فرحت صاحب کو اپنے عزیز دوست مولوی مظہر اللہ نظامی کے ذریعہ خط لکھا کہ وہ مجھکو یہ مضمون بصورت کتاب شائع کرنے کی اجازت دیں۔ مرزا فرحت صاحب نے جواب دیا اور ایسا جواب جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ میری خواہش کے قدردان ہیں۔ اُن کی اجازت حاصل ہوتے ہی میں نے اس مضمون کا نام "دہلی کی آخری شمع" مشاعرے کی رعایت سے رکھدیا اور چھپوانے کی تیاری ہونے لگی۔ دہلی کے مصوروں کو تلاش کیا کہ ان میں کوئی ایسا نکلے جو مرزا فرحت کے لفظی مرقعوں سے تصویریں بنادے اور میں اُن کو کتاب میں درج کردوں۔ مگر اب تک مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

خدا کا نام لے کر کاتب کو کتاب دیتا ہوں۔ تصویریں مل جائیں گی یا بن جائیں گی تو اُن کو بھی شریک کردوں گا۔ ورنہ مرزا فرحت نے مصوری میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ صورتیں دکھانے۔ لباس بتانے اور بول چال۔ رنگ۔ ڈھنگ کی نقل اُتارنے میں کمال کردیا ہے مصور سے یہ بات نہ ہوسکتی جو الفاظ کی تصویروں نے اس مضمون میں پیدا کردی ہے۔

میں چاہتا تھا کہ اس مضمون پر ایسا دیباچہ لکھوں کہ اس کی ہر خوبی پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے۔ مگر ایک جیتے جی غم والم کے پہاڑ کے نیچے دبا پڑا ہوں۔ ۳۰۔ جنوری ۱۹۲۵ء کی شام کو مجھ پر کسی ظالم نے پستول چلایا اور جی بھر کر گولیاں ماریں۔ میرا چہرہ اور سینہ اُس کے سامنے تھا اور وہ نشانہ باندھ کر فیر کررہا تھا۔ مگر کمبخت گولیاں نشانہ بازی کی حریف نکلیں۔ ایک

گولی نے بھی قاتل کا ساتھ نہ دیا اور کوئی گولی میرے نہ لگی۔ البتہ میرے بڈھے خسر پیرزادہ سید محمد صادق کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اُن کے گولی لگی اور وہ پون گھنٹے خاک و خون میں لوٹ لوٹ کر ختم ہو گئے۔

آج فروری ۱۹۲۸ء کی ۹ ۲ تاریخ ہے۔ گویا پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ لیکن خواجہ بانو کا غم پہلی گھڑی کی طرح تازہ ہے۔ اُن کے تو وہ باپ تھے۔ اور میرے بچوں کے نانا تھے۔ مگر میرے گھر کا بیان ہے کہ وہ اُس کے بھی باپ تھے اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ میرے ماموں زاد بھائی بھی تھے اور میرے بچپن سے آج تک سرپرست بھی تھے۔ اور اب بارہ تیرہ سال سے خسر بھی تھے۔ جنگل میں اکیلا گھر، دشمنوں کی قتل کے بعد بھی رات دن کی دھمکیاں۔ پولیس کے عجیب و غریب حالات، دماغ قابو میں نہیں ہے۔ اور دل تو شہید کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں کیا دیباچہ لکھوں اور کہاں سے وہ جذبہ لاؤں جو مرزا فرحت کے کمالات کی ترجمانی کر سکے۔

آخری بات یہ ہے کہ چوٹ کھایا ہوا دل خود ہی سمجھے گا کہ مرزا فرحت نے دہلی کی اس شمع کی زیارت کرا دی ہے جو مسلمانوں کی گذشتہ رات کو محفل کی رونق بڑھا رہی تھی اور مرنے والی قوم کی مٹنے والی تہذیب کو دکھا رہی تھی۔ اور جس نے صبح کے قریب روتے روتے ہچکیاں لیتے لیتے ایک آہ کی تھی اور ایک آہ کے ساتھ اس کا شعلہ بجھ کر اور دھواں بن کر اُڑ گیا تھا۔ میں دہلی شہر کے اندر اس کتاب کو شائع کر رہا ہوں۔ وہی دہلی جس کے مشاعرے کا اس کتاب میں بیان ہے۔ مگر نہیں یہ تو خواب کا بیان ہے۔ وہ دہلی اب کہاں؟ جس کی گردش شمع کا یہ افسانہ ہے۔ اب تو نہ کوئی شمع باقی ہے نہ کوئی پروانہ ہے۔

حسن نظامی ۲۹۔ فروری ۱۹۲۸ء

طبع چہارم

یہ کتاب فروری سنہ ۱۹۲۸ء میں پہلی بار اور سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری دفعہ اور سنہ ۱۹۳۶ء میں تیسری مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ اب سنہ ۱۹۴۳ء میں چوتھا ایڈیشن چھاپا گیا ہے۔

سر سید مرحوم نے اہلِ پنجاب کو زندہ دل پنجاب خطاب دیا تھا۔ اس کا ثبوت پنجاب کی موجودہ حکومت کے محکمہ تعلیم نے یہ دیا کہ یہ کتاب داخل نصاب تعلیم کی گئی۔ میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی اور حکومت پنجاب کو مبارک باد دیتا ہوں۔ طبع اول کے مورچے میں جن تصاویر کا ذکر تھا وہ اس چوتھے ایڈیشن میں بھی میسر نہ آسکیں۔

حسن نظامی دہلوی

دہلی کی آخری شمع کا پانچواں دیباچہ

(نوشتہ خواجہ حسن نظامی دہلوی)

۵۔ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء کی پچھلی رات کا ذکر ہے۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ مینہ برس رہا تھا۔ ۶۸ برس کا ایک بڈھا لحاف سے نکلا۔ بجلی کی روشنی کا سوئچ دبایا۔ روشنی ہوئی۔ گھڑی دیکھی۔ تین بجے تھے۔ سمندر سنسار۔ جاگتے پاک پروردگار۔ سامنے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی

کتاب دہلی کی آخری شمع کو رکھا دیکھا قریب ہی منشی سید قربان علی صاحب سلیم بسمل ایڈیٹر اردوئے معلےٰ دہلی کا ایک رقعہ رکھا تھا۔

"یہ کتاب ختم ہوگئی ہے۔ پانچواں ایڈیشن طبع کرانا ہے۔ دیباچہ لکھدیجیے تاکہ کاتب یہ کتاب لکھنی شروع کردے"۔

منشی صاحب بیس سال سے میری کتابوں کی کتابت و طباعت کا انتظام کرتے ہیں۔ اور میری دوکان انجمن اردو بک ڈپو دہلی کے منتظم بھی ہیں۔ میرے باپ کے ملنے والے ہیں۔ اور میں ان کو بھی باپ کی جگہ سمجھتا ہوں۔ میری طرح ہڈیوں کی مالا ہیں۔ مجھ سے زیادہ بڈھے ہیں۔ مگر جوانوں سے بڑھی ہوئی ہمت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر دیکھی اور کتاب کو ضروری کاموں کی جگہ رکھا دیکھی تو پہلے اپنی نئی کتاب "قرآن کے فرمان" کو پورا کیا جس کا کام بس اتنا باقی تھا کہ میں دیباچہ لکھدوں اور کاتب کو ترتیب کی ہدایات دیدوں۔

اس سے فارغ ہوکر کتاب آخری شمع کا پہلا دیباچہ پڑھا جو فروری ۱۹۲۷ء میں لکھا تھا۔ پھر چوتھا دیباچہ دیکھا جو ۱۹۴۰ء میں لکھا تھا۔ اس کے بعد اپنا خیال کیا کہ اب میں خود دہلی کی آخری شمع ہوں۔ اس کے بعد منشی قربان علی صاحب کا رقعہ دیکھا اور خیال کیا کہ وہ بھی دہلی کی آخری شمع ہیں۔

یہ سب کچھ تصور میں آتا رہا۔ اور میں نے جبھی قلم اٹھایا۔ روشنائی بھری قلم کے طلائی خول کو دیکھا۔ کاغذ اٹھایا۔ اور دہلی کی آخری شمع کا دیباچہ لکھنا شروع کیا۔

دیباچہ یہ ہے کہ پانچواں ایڈیشن اس زمانے میں شائع کیا جائے گا کہ دہلی میں اور سارے ہندوستان میں کاغذ دہلی کی آخری شمع بن گیا ہے۔ یعنی کہیں میسر نہیں آتا۔ اور جتنا کاغذ سرکار انگریزی کے افسر دیتے ہیں وہ

بھی اتنا کم ہوتا ہے کہ میں اس کو دہلی کی آخری اور ٹمٹماتی ہوئی شمع خیال کرتا ہوں۔

جاپان انگریزوں اور امریکنوں سے ہندوستانی سرحد پر اکان میں لڑ رہا ہے۔ جرمن ان دونوں سے اٹلی میں لڑ رہے ہیں۔ دہلی میں خوراک کی راشن بندی کی دھوم مچ رہی ہے۔ مٹی کا تیل لیمپ جلانے کو نہیں ملتا۔ بجلی کا کرنٹ بڑی احتیاط سے خرچ کرنے کا حکم ہے۔ مومی شمع ناپید ہے۔ اور اگر کہیں مل جاتی ہے تو مہنگی اتنی ہے کہ کوئی شاعر اپنی مجلس میں اس کو روشن نہیں کر سکتا۔ جیبی قلم کی روشنائی کی شیشی چار آنے کو آتی تھی۔ اب تین روپے کو آتی ہے جس کاغذ پر مضمون لکھا کرتا تھا اور ایک رُخ سادہ چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اب دونوں طرف لیپ دیتا ہوں۔ تاکہ تھوڑے کاغذ میں زیادہ لکھا جا سکے۔

دو سال سے اندھا ہو گیا ہوں۔ آپریشن ہوا تھا۔ ایک چھوڑ تین تین جب سے نہ حرف نظر آتے ہیں نہ کسی کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ البتہ رات کو روشنی پشت کی طرف رکھ لیتا ہوں تو لکھے ہوئے حرف نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اٹکل سے لکھ بھی لیتا ہوں یعنی لکھنے کی عادت سے کام لے کر لکھتا چلا جاتا ہوں۔ اور نہیں جانتا کہ ٹھیک لکھا ہے یا غلط لکھا ہے۔ کاتب عادی ہو گئے ہیں۔ وہ غلطیوں کو درست کر دیتے ہیں اور پوچھ لیتے ہیں کہ فلاں لفظ پڑھا نہیں گیا۔ فلاں سطر اوپر کی سطر پر اس طرح چڑھ گئی ہے جس طرح امریکن فوجیں جاپان پر چڑھ گئی ہیں۔ تو میں کاتب کو زبانی بتا دیتا ہوں کہ ٹھیک یوں ہے۔ اس طرح لکھنا۔ اس طرح نہ لکھنا۔

یہ ہے پانچویں ایڈیشن کا دیباچہ۔ جس میں نہ کتاب کا کچھ ذکر ہے نہ نئی اصلاح اور اضافے کا ذکر ہے۔ حالانکہ پڑھنے والوں کو اپنی محنت کی شان دکھانے

کے لئے اور کتاب کی طرف زیادہ راغب کرنے کے لئے لکھنا چاہیئے کہ اب کے
ایڈیشن میں کچھ ایسی چیزیں بڑھائی ہیں کہ کتاب میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ لکھ دیتا
کچھ اضافہ نہ کیا ہوتا، تب بھی لکھ دیتا۔ مگر میری پیاری بیٹی، روحہ کا بیٹا روحم
یکایک رویا اور اس کی آواز کو میرے محبت کرنے والے دل نے سنا تو یہ کہکر
قلم ہاتھ سے رکھ دیا کہ پہلی اشاعت کا دیباچہ لکھتے وقت روحہ بچہ تھی، اور
میری تحریروں میں رخنے ڈالا کرتی تھی۔ اور اب اس کا پانچ سالہ بچہ رخنہ انداز
ہوتا ہے۔ اور میں دیباچے کو ختم کر کے لکھ دیتا ہوں کہ کاغذ کے ہاکال کے بر
وقت میں یہ کتاب چھپ جائے تو اس کا دیباچہ بغیر راشن کی ڈبل روٹی کھلانے
کا مستحق ہو جائے۔

حسن نظامی

سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(۱)

تمہید

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم، انسان "ایک محشر خیال" ہے۔ لیکن خیال میں حشر بپا ہونے کے لئے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے۔ لیکن اس گنجینہ کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے، مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی۔ اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوشنما چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر کے

اُن لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف اُن کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا-خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی - اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرہ کا خاکہ پیشِ نظر کردیا. لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں - اس عقدے کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا۔

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا دل میں آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا - اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اُردو کے دہلی کے آخری دَور کا نقشہ کھینچ دیا جائے - قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے. اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا، بادشاہت برائے نام تھی- اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی- اُس میں قلعہ کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا- برخلاف اس کے لکھن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی - پھر بھی "دریائے جمنا کی چمکیلی ریت" دہلی والوں کے لئے نظر فریب رہی - اور اُس "اُجڑے دیار" میں شعرا ہی نہیں، ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنی دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا سنہ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملینِ فن میں سے بہت سے تو ملکِ عدم کو سدھارے، جو بچے کھچے رہ گئے تھے اُن کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا- جس کو جہاں کچھ سہارا ملا، وہیں کا ہو رہا- دہلی برباد ہو کر حیدر آباد اور رام پور آباد ہوئے- اکثر شرفا گھروں سے ایسے

نکلے کہ پھر اُن کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ بہت سے اُٹھ گئے۔ بہت سے اُٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اُن کی قبر کہاں ہے۔

ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اُردو کے لئے اُن سے ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبانِ اردو کے اُن محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور اُن کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم اُن کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اُس کی شکل، صورت، حرکات و سکنات۔ آواز کی کیفیت نشست و برخاست کے طریقے طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اُس کی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ مؤثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جس کے شروع میں اس کے حالات درج نہ کئے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبطِ تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنھوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو اُن کاملینِ فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں۔ بہت سے ایسے مرقع پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں بعض ایسے نقش ونگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اُتارے گئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہوں گی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں۔ لیکن ہر صورت میں شہادت تائیدی کے مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعے کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے حلئے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا۔ لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ اُدھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی، اُس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔ البتہ اچھے بُرے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ ۱۲۶۱ ہجری کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا، گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں۔ اور

ہمچو شبنم سبزہ بارہا دیدہ ام

بر قصد دہقان و قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر حیرت

دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں۔ اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا جس کے مکان پر یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی۔ اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ "مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے، جو اُن سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں"۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی اِن "خفتگانِ خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزمِ ادب اُردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجئے "میں" اب "مولوی کریم الدین صاحب" کی جون میں حاضر خدمت ہوتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور عرض کئے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ بُرا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہئے۔ مولوی صاحب کو کہئے اور خوب دل بھر کر کہئے۔ میں خوش میرا خدا خوش۔ والسلام

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۴)

تدبیر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے چالیس کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے۔ اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور رہا ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا۔ لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جائداد ضبط ہو گئی۔ میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے اُن کا دامن پکڑ لیا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے۔ اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اُٹھے۔ میں ۱۲۳۷ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا۔ میری تعلیم انہی دو بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن بے چین طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑا دیا۔ اُس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔ "ملا کی دوڑ مسجد" میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی آ گیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے۔ کاپی نویسی سے گزارا کرتا۔ محنت مزدوری کے بعد بھی ذوقِ علم ہر حلقۂ درس میں مجھے لے جاتا۔ اسی زمانہ میں دہلی کالج

کی تنظیم جدید ہوئی تھی۔ طالب علموں کی تلاش تھی۔ میں بھی اٹھارہ سال کی عمر میں وہاں شامل ہوگیا۔ سولہ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لئے حاصل کیا جاتا۔ اب اس کے ساتھ گزارے کی بھی ایک بڑی شس لگ گئی تھی۔ اس لئے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیئے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کرکے شعرأ کے حالات اور ان کا کلام طبع کروں۔ ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں۔ کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البالی ہیں۔ اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لئے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں۔ میرے باپ دادا عالم تھے۔ بھلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہوگئی اور مجھے قیام مشاعرے پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاصکر پردیسی غریب کو منہ نہیں لگاتے دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے۔ وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں عارف پر نظر پڑی۔ ان سے دو چار دفعہ سابقہ ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنوئیں کے پاس ایک حویلی ہے۔ اس کو مدرسہ

بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی تیس سال کی عمر ہے۔ گوری رنگت اونچا قد۔ اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ ڈاڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے۔ ٹھڈی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی۔ کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے۔ بہر حال اُن کی محبت ان کی شرافت اور سب سے زیادہ اُن کے رسوخ نے مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل اُن کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں حکیم صاحب کا مکان سرکیوالوں ہی میں تھا۔ واپسی میں دروازہ پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعہ اطلاع کرائی انھوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالی شان مکان ہے صحن میں نہر ہے۔ سامنے بڑا چبوترہ ہے۔ اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان۔ مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے۔ ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے۔ سامنے گاؤ تکیہ سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے تو اُن کو پہچانا بھی نہیں۔ سُوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ اور چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی۔ کہنے لگے "مولوی صاحب کیا کہوں؟ کچھ دل بیٹھا جاتا ہے۔ بظاہر کچھ مرض بھی نہیں معلوم ہوتا۔ علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے۔ کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے ہیں۔ مگر یہ تو کہئے آج آپ کدھر نکل آئے: میں واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایک آہ بھر کر کہا "میاں کریم الدین تم کو بات تو اچھی سُوجھی ہے۔ مگر

بھئی اس کا خیال مشکل ہے۔ تمہیں خبر نہیں۔ دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیئے ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو۔ میں بھی کرتا ہوں ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں ٹھہرو۔ حکیم صاحب کو آنے دو۔ ایک تجویز ذہن میں آئی ہے۔ اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنا پوری ہو جائے گی۔ اور تمہارا بھی کام نکل جائے گا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں۔ سفید بھری ہوئی ڈاڑھی۔ گول چہرہ۔ اس میں کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں۔ میں آداب بجا لایا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب صاحب سے کہا "آپ کی تعریف کیجئے" انھوں نے کہا "یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں۔ خود شاعر نہیں۔ مگر شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں اُن کے حلیے اور اُن کے کلام کے نمونے دکھائیں یہ مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پُرانے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں۔ اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔" حکیم صاحب کہنے لگے "میاں عارف خدا کے لئے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ابھی جوان ہو، انشاء اللہ خود طبیعت مرض پر غالب آ جائے گی۔ اور تمہیں مرض ہی کیا ہے، وہم ہی وہم ہے۔ مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟" نواب صاحب نے کہا "حکیم جی اور کچھ نہیں اتنا کردو کہ میاں

کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو۔ میں خود جاتا۔ مگر ہمت نہیں ہوتی۔ میں ان کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرے کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں اور اگر بدقسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرے کا خیال کرنا ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرہ کا انتظام وہ میں خود کر لوں گا۔ کیونکہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں۔"
حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے۔ پھر کہا "عارف! تمہارے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اس لئے اور بھی کروں گا کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائے گی اور کچھ دنوں اس مشغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے۔ بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک[1] بہادر سے ملا دیتا ہوں۔ اُن کو آج کل مشاعرے کی لو لگی ہوئی ہے۔ حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں۔ مگر وہ ٹال گئے۔ اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سُن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعۂ معلےٰ میں آجایئے۔ میں چوبدار سے کہے جاتا ہوں یہ اندر پہنچا دیگا۔ آگے آپ جانیں اور آپ کی قسمت۔" یہ کہکر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی وہ آیا تو اس سے کہا کہ "کل یہ صاحب

---

[1] ان کا نام مرزا فخر الدین خطاب مرزا فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا فخرو اور تخلص رمز تھا بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد بخت عرف مرزا شبو ولی عہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولیعہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ جولائی ۱۸۵۲ء میں ۳۸ سال کی عمر میں انتقال کیا اُن کے انتقال کے بعد مرزا جوان بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے ہوئے

حویلی[1] میں ایک بجے آئیں گے۔ اُن کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا" یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹ سے جبّہ پہن، عمامہ باندھ قلعۂ معلّی پہنچا۔ لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں "نشست" کہا جاتا تھا دیوانِ عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے مجھے دیکھ کر بولے "اجی مولوی صاحب! میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا۔ وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لئے لیتا ہوں۔ مگر مشاعرے کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہم لوگ بھی آسکیں۔ خیر بیٹھیے، شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔" میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا "وہ کریم الدین کون صاحب ہیں؟ اُن کو حضور پرنور یاد فرماتے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائیگا یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہِ جہاں پناہی میں یاد ہو گی اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہو گا۔ "حکم حاکم مرگِ مفاجات" اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا رہا آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ بندۂ خدا کدھر لئے جا رہا ہے۔ اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا۔ اب جو موقع ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی

---

[1] قلعۂ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن احسان کا شعر ہے

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں
بہادر شاہ غازی کی دوہائی ہے دوہائی ہے

چلتے چلتے آنکھ آگئی۔ آخر خدا خدا کرکے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لیجا کر کھڑا کر دیا۔ اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی؟ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالی شان عمارت ہے۔ اس کے دو درجے ہیں، ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رُخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں۔ اُن میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کئے کھڑا ہوں، اور ناک سے پسینہ کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نا زیبا۔ دوسرے دہشت کس کو معلوم۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی، اور چوبدار نے آکر کہا کہ "چلئے" اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح اُلٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے" نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجا لاؤ" میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔ دوہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے۔ بائیں مرزا

فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد۔ بہت نحیف جسم۔ کسی قدر لمبا چہرہ۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی۔ لمبی گردن۔ چہرہ کا ذرا اونچا۔ پتلی ستواں ناک۔ بڑا دہانہ۔ گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا۔ چھدری ڈاڑھی۔ کلّوں پر بہت کم۔ ٹھوڑی پر ذرا زیادہ۔ لبیں کتری ہوئی۔ ستّر برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید بھک ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ڈاڑھی میں اِکا دُکا سیاہ بال تھا۔ چہرے پر جھُرّیاں تھیں، لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک برکا پیجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کُرتہ۔ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین مین باپ کی تصویر تھے۔ ۳۲-۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بوڑھے تھے اور یہ جوان۔ اُن کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ اُن کا کھُلا گیہواں رنگ تھا۔ اُن کی ڈاڑھی سفید تھی ان کی سیاہ، ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اور بادشاہ سلامت نے فرمایا "اماں[1]

---

[1] قلعہ دہلی کے دور آخر میں شاہانِ دہلی بعض وقت مرد عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اس پُرانے طرزِ کلام کی جھلک حیدرآباد کی روزمرہ میں بھی کسی قدر نظر آتی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقۂ مخاطبت کی بنا پر قلعہ معلیٰ کی تہذیب و اخلاق پر حملہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ
(بقیہ مضمون صفحہ ۲۲ پر دیکھیے)

تمہارا ماہی نام کریم الدین ہے۔ تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا کہ "خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے حضرت ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آرہا ہے۔ فرمایا۔" اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوانِ عام میں مشاعرہ کردں۔ مگر کیا کروں؟ زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ "بود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے۔ ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازہ کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا۔ وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تتلیاں" ہی تھیں۔ کہیں خدانخواستہ اگر ردیف "لکڑیاں" ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم مشاعرہ تو کر رہے ہو۔ مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے۔ استاد ذوق تو بے چارے بے زبان آدمی ہیں۔ مگر خدا بچائے حافظ ویران سے وہ ضرور لڑ مریں گے۔ اور تم جانتے ہو اندھے کی داد نہ فریاد "دھما مار بیٹھے گا" کی صورت ہے کسی نے اگر مشاعرے میں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱) یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ورنہ اُن کو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں اُن کے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں" ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "ابا" کبھی "دادا" پکارتی ہے۔ (میرے خیال میں یہ "ارے میاں" کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہہ جاتے ہیں)۔ (ایڈیٹر رسالہ اردو)

استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔" میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں۔ مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمے لیا ہے۔ فرمایا "تو پھر مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے، مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا۔ رہے استاد ذوق، اُن سے میں کہہ دوں گا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائے گا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے اُن لوگوں سے مل لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبو تو آ نہیں سکتے ہیں۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیجدوں گا اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے۔ طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی "ملے ہے یہ انا بچہ تو کیا بے طرح سلا گئی ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرے میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ لمبا ایک نہ دینا۔" میں نے عرض کیا پیرو مرشد تاریخ؟ فرمایا ۱۴۔ رجب مقرر کر دو۔ دن بھی اچھا ہے، چاندنی رات بھی ہوگی۔ آج ۵ تاریخ ہے نو دن باقی ہیں۔ اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ انگریزی کی ۲۰ جولائی پڑے گی۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔ میں نے عمر و دولت و اقبال کی دعا دی۔ اور خوش خوش اُلٹے قدموں واپس ہوا۔ مرزا فخرو بیچ میں نہیں بولے۔ مگر میں سمجھا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں خلوت شاہی

سچ ہے "بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے" یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لئے حضوری اتنی مشکل نہ تھی جتنا رخصت ہو کر یہ اُلٹے پاؤں چلنا ہوا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگی تھی۔ اس لئے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا۔ خیر بہزار مشکل اب جادۂ ادب کو طے کر کے باہر نکل ہی آیا۔ اِدھر میں نکلا اُدھر چوبدار ساتھ ہوا۔ اس کو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا۔ وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ اُن سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے "مولوی صاحب! بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ انہیں کی یہ کارگزاری ہے۔ ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہوتا۔ مگر چلو تمہارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے بھی جا کر کہہ دو وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اُن سے حالات بیان کئے۔ کہنے لگے کہ "چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی۔ اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو۔ مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں۔ اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو ادھر کھو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ کیا عجب ہے کہ میرا نام سنکر راضی ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے

حالہ کردو۔ مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے عرض کی "اوہ میں کہاں جاؤں؟" فرمانے لگے "میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لئے آجاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو انہیں کے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "مشاعرہ میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو سوا سو روپے اُٹھ جائیں گے۔" یہ سنکر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے۔ ہزار دہ ہزار میں بھی اگر پوتھ پورا ہوگیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔" یہ سنکر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میں نے کہا "نواب صاحب! اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرہ کو دُور ہی سے سلام ہے۔ مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اُٹھے۔" فرمانے لگے "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ خدا یہ مشکل بھی آسان کردے گا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کلام جانے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کردینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں۔ بات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ تم تھک بھی گئے ہو۔ ذرا آرام لے لو۔ اور کل صبح سے اِدھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو۔ اُدھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہوجائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔ آخر میرے ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔" وہاں سے نکل میں اپنے گھر آیا۔ مطبع بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہوگئی۔ صبح اُٹھکر اپنے پہننے اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر بھجوا دیا اور خود کابلی دروازے کی طرف چلا کہ پہلے استاد ذوق ہی سے بسم اللہ کروں

کابلی دروازہ کے پاس ہی ان کا مکان ہے۔ مکان بہت چھوٹا ہے چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لئے مشکل سے جگہ رہتی ہے سامنے چھوٹا سا دالان ہے۔ اور اس کے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانہ مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھرّی چارپائی پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔

دوسری چارپائی پر اُن کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے یہ اندھے ہیں اور انہی سے ہوشیار رہنے کے لئے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں۔ رنگ اچھا سانولا ہے۔ چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑ کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پیجامہ سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا، "کون ہے؟" میں نے کہا کریم الدین، استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔" استاد نے اپنا نام سنکر کہا "آیئے آیئے، اندر تشریف لایئے"۔ میں نے آداب کیا۔ انھوں نے فرمایا "بیٹھو، بھئی بیٹھو" میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمایئے کیسے تشریف لانا ہوا؟" میں نے عرض کی کہ "میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ ۱۴۔ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر حضور بھی ازراہ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے "جایئے جایئے کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ اُستاد کو فرصت

نہیں ہنے۔ اُن مرزا لے پالک کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو دق کرتے ہو؟" اُستاد نے کہا "بھئی حافظ ویران تمہاری زبان نہیں رکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو؟" حافظ ویران کہنے لگے "استاد! جب وہ آپ کو بُرا بھلا کہیں تو ہم کیوں چُپ بیٹھے لگے۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے۔ اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں کل ہی کی بات ہے آپ کو "نادرہ" کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے۔ اُن کی سات پشت کو تو م ڈالا" اُستاد ہنس کر فرمانے لگے "نا بھئی نا! تم میری وجہ سے کیوں بلائیں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے سو کہے۔ میں نے تو اُن سب کا جواب ایک رباعی میں دیدیا ہے!

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق	ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور جو خود تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے	کیوں بُرا کہنے سے اُسکے تو بُرا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ "میں کل بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور وہ اپنی غزل بھی بھیجکر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ اُستاد ذوق سے بھی کہدیں گے وہ بھی مشاعرہ

لہ ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اُڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ انھوں نے انکو پال لیا ہے۔ اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے حسب نسب میں انھوں نے کیڑے ڈالے۔ استاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے انکے ہاتھ میں اُسترے کی بجائے تلوار دیکر انکو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

میں ضرور آئیں گے۔" یہ سنکر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ اُستاد نے فرمایا "ہاں بھئی مجھے یاد آگیا۔ کل شام کو حضرت پیرومرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاء اللہ تعالےٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے؟" میں نے واقعہ عرض کیا، اور کہا کہ "حضرت ظلِ سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکال دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے آکر غزل پڑھے"۔ اُستاد تو "بہت خوب۔ بہت خوب" کہتے رہے۔ مگر حافظ ویران کی تیوری کے بَل نہیں گئے۔ برابر بڑبڑاتے رہے کہ "اللہ خیر کرے، دیکھیئے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے حضرت پیرومرشد بھی بیٹھے بیٹھے اشطلے[1] چھوڑا کرتے ہیں"۔ وہ اپنی کہے گئے۔ میں تو اُٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بَلّی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے گلی قاسم جان کی گلی کٹی ہے۔ بائیں طرف پہلا ہی مکان اُن کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا اونچی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے۔ اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔

---

[1] معلوم نہیں یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ مگر دہلی میں عام طور پر "شگوفے" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہو گی حسین اور خوش رو آدمی ہیں قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا موٹا نقشہ اور سُرخ سفید رنگ ہے۔ لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ ڈاڑھی بھری ہوئی ہے۔ مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا۔ اُس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے۔ جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے۔ ایک برکا سفید پجامہ۔ سفید ململ کا انگرکھا، اُس پر ہلکے زرد زمین کی جامے واری چغہ[1]۔ میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا۔ سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آ گئے۔ یہ امین الدولہ خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں ریختی (اُردو) میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے ہیں۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشا پردازی۔ جغرافیہ۔ تاریخ علم الانساب اسمائے رجال تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد۔ بہت گورا رنگ۔ نازک نازک نقشہ نیلی نیلی آنکھیں۔ لگی ڈاڑھی چھریرا بدن۔ غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک برکا سفید پجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اُنھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دو زانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب

[1] قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے۔ اس سے یہ لباس لیا گیا۔

بھی لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے "ہیں میاں نیرؔ، تم کس وقت آ بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں" میری طرف دیکھ کر کہا "آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں"؟ میں نے کہا "جی ہاں" فرمانے لگے "حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا۔ کل ہی میاں عارفؔ آ کر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیرؔ! تم بھی چلو گے"؟ نواب صاحب نے کہا "جہاں آپ وہاں میں" "آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا" مرزا صاحب نے پوچھا "مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے" "مجھ کو کل سے انکا انتظار ہے۔ اے لو وہ آ ہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے۔ ابھی میں تم ہی کو پوچھ رہا تھا"

نواب علاء الدین خاں علائیؔ، نواب لوہارو کے ولی عہد ہیں۔ کوئی ۴۰، ۴۲ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد۔ گندمی رنگ۔ موٹا موٹا نقشہ۔ گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ موری کا پیجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا۔ اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیم آستین اور سر پر سیاہ ہی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے، اور کہا "واقعی آج دیر ہو گئی۔ مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہوں گے" میری طرف دیکھ کر کہا "آپ کی تعریف"؟ مرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا "علائی

تم کو بھی چلنا ہوگا۔ ابھی تو شاید لوہارو نہیں جا رہے ہو۔" انھوں نے کہا "بہت خوب آپ تشریف لیجائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں۔" جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر نواب زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ انھوں نے مردانہ کا ایک حصہ میرے لئے خالی کر دیا تھا، جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اس کو جا جما پایا۔ کپڑے اتارے اندر سے کھانا آیا، کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے اُستاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے۔ منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں سر پر پٹھے ہیں۔ بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں۔ کوئی ۵۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک برکا سفید پیجامہ۔ سفید انگرکھا۔ کشمیری کام کا جبّہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سا سفید عمامہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچہ ہی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا "حکیم مومن خاں کے پاس۔" پوچھا "کیا کام ہے؟" میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔" حکیم آغا جان کے چھتّے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف دو صحنچیاں ہیں۔ اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرہ کا صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے[1]۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے

[1] مضمون نوٹ صفحہ ۱۰۳ پر پڑھیے۔

اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے۔ قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا، مؤدب دو زانو بیٹھے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی۔ کشیدہ قامت تھے۔ سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنویں۔ لمبی ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ اُن پر پان کا لاکھا جا ہوا۔ مسی آلودہ دانت۔ ہلکی ہلکی مونچھیں خشخاشی ڈاڑھی۔ بھرے بھرے بازو۔ پتلی کمر۔ چوڑا سینہ۔ لمبی لمبی انگلیاں + سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال۔ زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا۔ لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ۔ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹہ کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا۔ اور اس کے دونوں سرے

(سلسلہ) سبق حاشیہ صفحہ ۳۱) میں نے خود یہ مکان بیس بائیس برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی۔ سامنے کا حصہ قائم تھا۔ معلوم نہیں کہ اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے۔ ہاتھ، اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے اُن کا انتقال ہوا خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی۔ "دست و بازو بشکست"

ساتے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خارپشت، پاؤں میں سرخ گلبدن کا
پجامہ۔ پھریوں پر سے تنگ اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک برکا پجامہ
بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو، ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ جوڑا سُرخ
نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں۔ کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی
اُلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی ٹری دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے
پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی۔ اندر سے
مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت
خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب میں اور مولانا صہبائی دونوں
پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین "حیا" سے کہہ رہے تھے کہ "صاحب عالم
تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے، ایک ہوں۔
دو ہوں، آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے" صاحب
عالم نے کہا "اُستاد کیا کروں، ریذیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے
شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں، کچھ تو میں خود حل کر کے اُن کے
پاس بھیجتا ہوں۔ جو سمجھ میں نہیں آتے، وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں"
حکیم صاحب نے نظر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لے کر کہا "بیٹھیے
بیٹھیے" ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔
"میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے
تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہوگی، میں کہتا ہوں نہیں، سبز کو ہوگی۔
تم بساط بچھاؤ۔ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی
سے بات کر لوں۔ اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ میں حکم لگا چکا
ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے

کی دیوار سے نہ جائے گی۔ اس کا جوڑا آئے پر آئے۔" سکھانند حکیم تھے۔ رقم تخلص کرتے تھے۔ دھرم پورے میں رہتے تھے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی۔ ریختے میں شاہ نصیر کے اور دلی میں خاں صاحب کے شاگرد تھے۔ بڑے خوش پوشاک، خوش وضع۔ خوش اخلاق، ظریف الطبع۔ حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سنکر "بہت خوب بہت مناسب" کہتے رہے اُن سے گفتگو کرکے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔ "ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے اور آپکے ساتھ یہ صاحب کون ہیں"؟ مولوی صہبائی نے کہا "یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے۔ اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں"۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا "بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجیے۔ اب دلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں[1]۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! کا غل مچا کر طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہدہد کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ اوروں پر حملہ کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں اور اپنے نااہل پٹھوں کو مقابل میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہ

ہرگز محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں ناخنِ قوسِ قزح، شبہ مضراب نہیں

[1] یہ استاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے، تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر
ناگوار گزرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا اُن کے اُستاد پہلے مرزا
نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب[1] تو اُن کی بات
دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں۔ مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے۔
بلکہ اُن کی وجہ سے مشاعرے میں کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے
تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔ میں نے عرض
کی کہ "اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ
کر لیا ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی بھی غزل آئے گی۔" فرمایا ہر شخص مختار ہے
چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے۔ میں نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا۔
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لیکر
آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا
آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے اُن کو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو
پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آکر
ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اُتاری۔ اس میں سے پٹ سے ایک
چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے
سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اس سے آملی۔ اور دونوں ملکر
ایک طرف چلے گئے[2]۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ جب دونوں

[1] ان کا مفصل حال آگے آئے گا۔ یہ بھی عجیب رقم تھے۔

[2] یہ واقعہ ہے۔ اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے
انتقال ہوا ہے۔ میں نے یہ واقعہ خود اُن کی زبانی سنا ہے۔

چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا "کہو میاں
رقم، تم نے دیکھا" اُنھوں نے کہا "جی ہاں، ایک خانہ کے حساب لگانے
میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُس کی معافی
چاہتا ہوں" کہنے لگے اس کا خیال نہ کرو۔ انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے
ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے"
میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں،
تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا "مجھے
تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے۔ سب کیا دھرا نواب زین العابدین
خاں عارف کا ہے۔ وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اُن کو اب زندگی
کی امید نہیں رہی۔ ان کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا
مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر
ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے اُن کو کہیں آنے جانے سے
منع کر دیا ہے۔" یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب
بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش
صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "افسوس ہے، کیا خوش فکر اور
ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"
میری طرف دیکھ کر کہا "اچھا بھئی تم جاؤ، میری طرف سے عارف سے
کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل
گیا تو اور پاؤں پھیلائے۔ اور کہا "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا
کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں
صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔" حکیم صاحب کہنے لگے

"میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں۔ اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے راستہ میں اُن سے بھی کہتے جاؤ۔ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے؟ مشاعرہ کہاں ہوگا اور طرح کیا ہے"؟ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔ طرح کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے "ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں۔ جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں طرح نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلہ کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے تھے۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے۔ دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ یہ سوچ کر اندر گیا مکان کوٹھی کے نمونہ کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے والان در والان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ اُن پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے

تخت پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶ - ۵۷ سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں۔ بھری ہوئی ڈاڑھی۔ بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سفید ایک بر کا پیجامہ۔ سفید کرتہ۔ اور سفید ہی عمامہ تھا[1]۔ جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا اُن کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی۔ بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا۔ تنگ مہری کا سفید پیجامہ۔ سفید کرتہ۔ نیچی چولی کا سفید انگرکھا۔ اور قبہ نما پچگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

---

[1] پرانے زمانہ میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے۔ ورنہ سارا وقت مردانے میں ہی گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گزرتا۔ خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوئی۔ ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیئے رہتے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوزانو مؤدب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے۔ کوئی ہنسی کی بات ہوئی ذرا مسکرا دیئے۔ کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

میں آداب کرکے تخت کے ایک کونے پر دو زانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا "ہیں! خاں صاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کرلیا ہے۔ بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔" میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "ہاں یوں کہو، یہ بات ہے، ورنہ مجھے تو یہ کر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہہ دینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے۔" یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خان سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا عجب حال بیان کیا تو اُن کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے، میاں کریم الدین تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے۔" میں نے کہا نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں۔ اُن پر تو آپ کی بیماری سننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ان کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کرلیا تھا۔ صرف آپ کی وجہ سے اُنھوں نے یہ عہد توڑا ہے۔ نواب صاحب نے کہا "میاں تم کو ان لوگوں کی بہتوں کا کیا حال معلوم؟ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ خیر اس کو جانے دو۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں؟" میں نے کہا، "جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں۔" فرمایا "نہیں بھئی، نہیں، جہاں دو آدمیوں نے

مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو۔ بلکہ تم تو ادھر آنا بھی نہیں۔ تم نے آ کر اگر مین میخ نکالی تو مجھ پر دوہری تہری محنت پڑ جائے گی۔

(۳)

ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند
نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابوالفداء کے ترجمہ میں ایسا گتھ گیا کہ ۷، ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر گھر میں اُن کی صورت دکھائی دیتی۔ اس لئے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہر حال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے۔ اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ ۱۴۔ رجب کو شام کو ۴ ۱/۲ بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں۔ کوئی کہتا کہ اس سے کیا کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں

لگا کر اور اُن میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب بھیڑ بھاڑ ہے۔ کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزارِ آتشین کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا " واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا! کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ۔ واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا۔ کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا" چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے در و دیوار پڑے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری، چاندنی کا فرش۔ اس پر قالینوں کا حاشیہ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار۔ جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوارگیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ۔ گنگا جمنی چوبوں پر سنہری ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند پیچھے سبز[1] کارچوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے۔ فانوسوں کے کنول

---

[1] سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

بھی سبز۔ چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا
کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے۔ بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں
سے جن کے سروں پر منقش کے گپھے تھے۔ اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا
کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔
دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں
نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے۔ اس سرے
سے اس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے کھنچی ہوئی تھی
چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف
اس طرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا
انتظام تھا۔ کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں
لگی ہوئی تھیں۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں
کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست
بستہ مؤدب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک عنبر اور اگر کی خوشبو سے پڑا
مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں
کی قطار تھی۔ حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دوکان
پر سے اُٹھ آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی
تپائیاں رکھ کر اُن پر خاصدان رکھ دیے تھے۔ خاصدانوں میں لال اطلس
کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا
تھا کہ بیچ میں ایک ایک تہ پھولوں کی آ گئی تھی۔ خاصدانوں کے برابر
چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ اُن میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بُن دھنیا مسند
کے سامنے چاندی کے دو شمعدان اندر کافوری بتیاں۔ اوپر ہلکے سبز رنگ کے

چھوٹے کنول۔ شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن۔ لگنوں میں کیوڑا۔
غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشہ تھا۔ میں تو الف لیلے کا ابو الحسن ہو گیا۔ جدھر
نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی[1]۔ میں اس تماشہ میں تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ
شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی
ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے۔ مگر شاعری میں اپنے برابر
کسی کو نہیں سمجھتے۔ بہت رحمدل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دخل فعل
نام کو نہیں ہے۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور
اُترے سب سے پیچھے!! انھوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا
ہے۔ مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے
سب نہ چلے جائیں یہ اُٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ
ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا، سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا۔
لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند۔ جب تک
سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جُھک جُھک کر آسمان
دیکھ لیتے۔ اتنے میں موسلا دھار مینھ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا، ایسا
برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینھ
تھما، تو یہ بھی اُٹھے، مگر ایسا اندھیر الگھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا
تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں
ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا
کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہ اسی پر اس مشاعرہ کا نقشہ قائم کیا ہے۔

مجھے دیدئے۔ اس کا جوتا کیا تھا لیتڑے تھے۔ وہی گھسیٹتے ہوئے چلے۔ اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچکر ایک نیا جوتہ نوکر کو دیا اور کہا "میاں تونے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا کہ تمام عمر نہ بھولوں گا۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو۔" آگے چل کر اس بدمعاش نے انکو بہت دق کیا۔ اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ دوسرے ہر تیسرے چوتھے اُن سے ایک دو روپے مار لاتا۔ مگر انھوں نے کبھی "نا" نہیں کی۔ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لبِ فرش ان کو لیا اور پوچھا "ہیں صاحبِ عالم! میاں حیا، آپ کے ساتھ نہیں آئے؟" مرزا رحیم الدین حیا، اُن کے بڑے بیٹے ہیں۔ لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحبِ عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے۔ کہنے لگے "نواب صاحب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے۔ جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں۔ وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، شاعر بنایا۔ بٹیریں لڑانا سکھایا۔ اور تخت[1] کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہونگے اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ اُستاد ماننا تو درکنار مجھ کو باپ

[1] گئے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادہ کے دلمیں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل ہیں ہی بادشاہ ہو جائیں۔ اس لئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی، تاج کی، اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

بھی کتنے بشر ملتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو، تیرہویں صدی ہے ان کو بلا سن
بھیجکر میں تو مصیبت میں آگیا۔ ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔
بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور مول لے لی"۔ یہ باتیں
کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو لے جا ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی
اُن سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن
احسان کو جھرمٹ میں لئے آپہنچا۔ بھلا دلّی شہر میں کون ہے جو حافظ جیو
کو نہ جانتا ہو۔ جگت اُستاد ہیں۔ پہلے تو قلعہ کا قلعہ اُن کا شاگرد تھا مگر
اُستاد ذوقؔ کے قلعے میں قدم رکھتے ہی اُن کا زور ذرا ٹوٹا۔ پہ بھی
زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لے چکے تھے۔
اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے اور مرتے دم تک مقابلے
سے نہ ہٹتا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی۔ کمر دوہری ہونے سے قد
کمان بن گیا تھا اپنے زمانے کے ملبم باعور تھے۔ لیکن غزل اس کڑاکے
سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ اُن کی اُستادی کا
سکہ ایک زمانہ سے تمام دلّی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلی کے استاد
ہوئے۔ رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نوراللہ مرقدہٗ تک رسائی
ہو گئی۔ وہ اُن کو "حافظ جیو" کہتے تھے۔ اس لئے اس نام سے تمام قلعہ
میں مشہور تھے۔ مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا۔ اور سند ایسی تڑاخ
سے دیتے تھے کہ معترض منھ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ
سلامت نے مصرعہ کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

انھوں نے فوراً عرض کی۔

نامناسب ہے میاں وقتِ سحر گاہ نہیں؛

کسی نے "وقتِ سحر گاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انھوں نے جھٹ عنایت کا یہ شعر پڑھا۔

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقتِ سحر گاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

بڑے دُبلے پتلے آدمی تھے رنگ بہت کالا تھا۔ شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے۔

اے خالِ رُخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لا کر بٹھا دیا۔ ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں کبھی استاد ذوق کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے۔ لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں۔ شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سُنی اور یاد کرلی مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منھ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے۔ مزاج پُرسی کی، کہنے لگے "مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے؟" نواب صاحب نے کہا ابھی شروع ہوتا ہے۔ آپ بیٹھئے تو سہی۔ خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔

اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اس کا استقبال

نواب صاحب کرتے اور لا لا کر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے۔ ان کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسہ میں اُن کی ذاتِ بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں۔ اس لئے خود شعر نہیں کہتے۔ مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ اُن کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دیدینا ہے۔ کوئی ۵۰ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانوتہ کے ہیں۔ مگر مدتوں سے دہلی میں آرہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں۔ یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے بچارے پابندیٔ شرع اور تقوی کی وجہ سے چکر میں آگئے تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم اور رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر وہاں رہے اُنھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دُور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگادی۔ اُن کو بہت غصہ آیا۔ کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر ان کی عزت افزائی کی۔ انھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔[1]

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا، آداب کیا۔

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے۔ مگر نام نہیں لکھا۔ مجھے یہ واقعہ اُنہی کی زبانی معلوم ہوا۔ سنکر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے دوگونہ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا

فرمانے لگے "میاں کریم الدین! میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے دہلی والوں کو بھی مات کر دیا۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا انتظام ہے۔ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ خدا تمہیں اس سے زیادہ حوصلہ دے"! میں نے عرض کی مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے"! فرمانے لگے "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی، وہ کہیں سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے، تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے۔ چلو، من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے نیر۔ علائی۔ سالک اور حزیں ان کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے۔ مصافحہ کیا اور کہا "بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر جان محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا۔ تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا۔ اب یاروں کو روتے ہیں۔ دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے۔

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں مجھے یارانِ وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے۔ ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا"! حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے۔ کہ دروازے کے پاس سے السلام علیکم کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا "لیجئے مرزا صاحب وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہدہد بھی ساتھ ہیں۔ دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں"! "میاں ہدہد کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ پورب کے رہنے والے

ہیں۔ دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا۔ انہی کی تجویز سے چگی داڑھی رکھی۔ سر منڈا کر نکو عمامہ باندھا، اور اس طرح خاصے کھڑک بزرگ ہو گئے۔ انہی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے۔ اور طائر الاراکین شہپر الملک ہُدہُد الشعراء، منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا۔ مگر بعد میں انھوں نے استادانِ فن پر حملے شروع کر دیے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے ایسا کیا۔ لیکن کچھ بھی ہو، آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہو گئی اور بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو علانیہ ان کی مدد کر نہیں سکتے تھے۔ خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی۔ جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسی لیے مولانا صہبائی کے منہ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سن کر مرزا نوشہ مسکرائے۔ اور کہا "بھئی ہیں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگا۔ مگر آج دیکھا جائے گا۔ ہر فرعونے را موسیٰ سنتا ہوں۔ کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ شہبازِ سخن ٹک گیا تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا۔" غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی آ پہنچے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ الٹ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح پیشانی تک لے جاتے ہیں جیسے کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے۔ اور پھر جھک

ہیں، چلو سلام ہوگیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لئے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے۔ سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن۔ وہی پتلی اونچی ناک۔ لمبا کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں۔ بڑا دہانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں۔ گہرا سانولا رنگ۔ ڈاڑھی کلوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ، غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے شاید کسی خاندان والوں میں ہوگی۔ امیر تیمور سے لے کر اس وقت تک اُن کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس[1] تھا۔ مگر اب کچھ دورنگی ہوگئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے

[1] اس مضمون میں جابجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں۔ تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو۔ وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں۔ اُن کی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی۔ نہ ترکی تھی۔ نہ تاتاری کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سی لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرا اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا رہے۔ اس کے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبائی تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گرگج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی۔ اندر استر دے دیا۔ چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہوگئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے۔ جس کو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں۔ اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اس کا دمہ (گوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے۔ دمے کے اوپر چار پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے۔ چاروں کو اس طرح ملا دیتے ہیں کہ چاروں کونے

سلیمان شکوہ کا اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں
جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جاتا
آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر
ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انہی کو دیکھ لیجیے
جو شاہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں ان کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے اونچی
چولی کا انگرکھا ہے۔ نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پیجامہ ہے جنھوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰) کرک (کرخ) کے نمونے کے ہوا ہیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا
جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دیے کو اونچا کر کے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا
دیا ہے اور ان کے سلجانے کے بعد جو پہلو ہوئے ہیں ان کو پھر کاٹ کر پان ڈال دی
ہیں۔ اس طرح بجائے چار پہل کی ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں۔ خوبصورتی کے لئے دیے
کے کناروں پر پتلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ بادشاہ
سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے لپی ہوئی اور
جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے۔ اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ والے تو
پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں۔ باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ پہل کی
ہوتی ہے اس کے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دیے کے باہر پھیل کر کنول
کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے۔ اور وہ بھی اس طرح
کہ اس کا ایک کونہ بائیں بھوں کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرقچین)
ٹوپی کا بہت رواج ہے۔ اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں
کو سر کی ناپ کے برابر سی لیا۔ نیچے پتلی سی گوٹ دے دی۔ اور اوپر کے حصہ میں
چنٹ دے کر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں
صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے برخلاف

قلعہ کبھی نہیں چھوڑا۔ ان کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا۔ اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی خفتان۔ پاؤں میں گلبدن یا غلطے کا ایک برکا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں انھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ داڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے۔ چہرے کی ساخت سے اُن کو دہلی کا شہزادہ کہو، تو کہہ دو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱) اس کے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اس کی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے فصیل کے کنگرے۔ نیچے دے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے یہ ٹوپی قالب چڑھا کر پہنی جاتی ہے۔ قالب چڑھ کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہیں اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں۔ اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھا کر پہنتے ہیں۔

لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ دہلی کے انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لئے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لئے آستینیں بہت چست رکھتے ہیں۔ اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر الٹ لیتے ہیں۔ انگرکھے کے نیچے کرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعہ والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے۔ بہت تکلف کیا تو اس کے حاشیوں پر سمور لگا لیا۔ نہیں تو عموماً پتلی لیس لگاتے ہیں۔ بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے۔ جس کو عاشق معشوق یا چشمے کہتے ہیں۔ اس کی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے داہنی طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُن کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہئے تھا تو بجائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اُٹھاتے خود ایسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲) قلعے میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے۔ مگر شہر والے اس سینہ کھلے نیم آستین کو "شیروانی" کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر چوکور شالی رومال سموسہ کر کے پٹکے پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں "ارخ چین" (عرق چین) کہتے ہیں۔ کمر میں بھی بتی کر کے رومال لپیٹنے کا رواج ہے۔ مگر بہت کم۔ پائجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے۔ اکثر گلبدن غلطے مشروع۔ موٹرے۔ اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پُرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک برہی کا پائجامہ پہنتے ہیں مگر تنگ مہریوں کے پائجامے بھی چل نکلے ہیں سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہوگا جس کے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر لمبے کا چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈ ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے تیل پلاتے۔ مہندی مل کر باورچی خانہ میں لٹکاتے۔ یہاں تک کہ اس کی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی اور وزن تو ایسا ہو جاتا گویا سیسہ پلا دیا ہے۔ جو نکلتا ہے اینٹھتا ہوا نکلتا ہے جس کو دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر، بنے ہوئے ڈنڈ۔ شرفا میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو۔ اور بانک، پھکیٹی اور لکڑی نہ جانتا ہو۔ بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مقابلے ہوتے ہیں۔ واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں۔ اور فنون سپہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

جگہ جا بیٹھے جہاں اُس کو بٹھانا چاہتے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا" وہ آ کر اُن کے پاس بیٹھ جاتا، اس سے باتیں کرتے رہتے۔ اتنے میں کوئی ایسا شخص آ جاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لئے موزوں سمجھتے اس سے کہتے "تشریف رکھئے وہ جگہ خالی ہے"۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اس طرح نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوق خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام اُنھوں نے خود کر لیا۔ مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بند و بست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے "صاحب عالم ادھر آئیے" کسی سے کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے، کہتے "بیٹھو بھئی بیٹھو" غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعہ سے تھا۔ اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور ان کے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعہ والے جتنے آئے تھے سب کے ہاتھوں میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے۔ روزانہ تیتروں، بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے ایک بڑے چھکڑے پر کھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے۔ اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے۔ کھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی بٹریاں جہاں چاہا چھکڑا لے گئے اور بٹریاں اڑا دیں۔ ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ چھکڑے سے ایک بھی چھٹ کر نہیں جاتی۔ اُنھوں نے جھنڈی ہلائی اور

وہ اُڑیں۔ انھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھوت پر بیٹھ گئیں۔

اُستاد ذوقؔ کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آپہنچے۔ اُن کے ساتھ نواب مرزا خاں داغؔ تھے۔ میاں داغؔ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے۔ مگر چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی۔ سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم میں ساسنلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدن کا پیجامہ۔ ہاتھ میں ریشمی رومال۔ ہیں تو ابھی نو عمر، مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغؔ اُترے اور اُتر کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ اُن کے بعد مرزا فتح الملک اترے۔ اُن کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سروقد کھڑے ہوگئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی اچکنیں پہنے، سُرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیے، ہوادار کے پیچھے تھے۔ اُدھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا اِدھر عصا بردار تو ان کے سامنے آگئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لیے۔ اس سلسلے میں یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا، پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا "اجازت ہے؟" سب نے کہا "بسم اللہ بسم اللہ" اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے۔ اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے

لہ مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغؔ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد ان کی بیوی یعنی داغؔ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغؔ قلعہ میں رہتے تھے۔ (نواب فتح الملک بہادر مرزا فخرو تھے)

سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اُن سب کی طرف نظر ڈال کر کہا "تشریف رکھئے، تشریف رکھئے!" سب لوگ سلام کرکے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ استاد ذوقؔ نے داغؔ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہو گیا تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے۔ شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے۔ اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحبِ عالم سے کچھ باتیں کیں۔ اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ان کے اُٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحے[1] کو اُٹھائے۔ ساتھ ہی اہلِ مجلس نے ہاتھ اُٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحبِ عالم نے فرمایا "اے خوشنوایانِ چمنِ دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے اُستادانِ فن کے ہوتے ہوئے میرِ مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں۔ صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمانے کی تعمیل میں حاضرِ خدمت ہو گیا ہوں۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں اتنے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی۔ محبّو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لیے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے، اُسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے

---

[1] نواب فتح الملک بڑے کٹّے مسلمان تھے۔ کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے۔ اسی لئے سب قلعہ والے ان کو "مُلّا" یا "مُلّیٹا" کہا کرتے تھے۔

اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے۔ لیکن اس مشاعرے میں ہیں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظلِ سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی۔ اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔" یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے۔ انھوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبداروں نے شمعیں لیجا کر لگنوں میں رکھدیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باآواز بلند کہا "حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے"!

اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا ہو گیا۔ قلعہ والوں نے بٹیریں تھیلیوں میں بند کر تکیوں کے پیچھے رکھدیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیئے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان اور پن دھبنے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لئے ہوئے قلعے سے آگیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے۔ وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجالایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

"حاضرین! حضرت ظلِ سبحانی، صاحب قرانِ ثانی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوشِ دل سے سماعت فرمایا جائے"!

تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے سے نکالی، بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے منھ سے سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے، ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری رہا تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا لیجئے آپ بھی پڑھئے اور زبان کا لطف لیجئے۔

ہمیں عشق میں اس کا رنج ہیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب ہے دیر جو ساقی تو ہائے

کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے نازِ کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا!

ظفرؔ آدمی اُسکو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لے کر اِدھر اُدھر دیکھا، ملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "صاحب عالم! ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسے چاہیئے ویسی تعریف کر سکیں۔ البتہ ان نوازشاتِ شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہِ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔" مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا اُس نے عرض کی "قبلۂ دو عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیشگاہ عالی میں پہنچا دوں گا۔" خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے؟" یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا۔ اس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سنائی۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے
مہربانی کی نشانی اور ہے

قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے — عشق کی میرے کہانی اور ہے

رو کنے سے کب مرے رُکتے ہیں اشک — بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے

ہم ہیں لے دار او وہ کب ہوتے ہیں ممات — اُن کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھس پھسی تھی۔ مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی۔ بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے بعض قلعہ والوں کو برا بھی معلوم ہوا۔ مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ولی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواصی تو غزل پڑھکر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دونوں شمعیں لا شامیانے کے سامنے رکھدیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر اُدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں۔ البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بہ نظر اصلاح عرض کرتا ہوں"

۱۔ غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

۲۔ حال کھل جائیں غیر کے سامنے — پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا

۳۔ درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

۴۔ وہ تو ملتا، پر لے دلِ کم ظرف — تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

۵۔ شکوۂ یار اور زبانِ رقیب — کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا

۶۔ تم رہو اور مجمعِ اغیار — میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

۷۔ پھر تمہارے ستم اُٹھانے کو — رمز اچھا ہوا، برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی۔ مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سُنکر دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو انہی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا "سبحان اللہ! صاحب عالم! سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے شعر یوں کہتے ہیں۔ مزہ آگیا۔ اُستاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جُھک جُھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا سامنے کی صف میں میاں پَلی کے آگے رکھدی۔ نام تو ان کا عبد القادر تھا۔ مگر شہر کا بچہ بچہ اُن کو میاں پَلی کہتا تھا۔ ان کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور[1] تھا کہ کسی پہلوان کو

[1] اس غرور ہی نے آخر اُن کو نیچا دکھایا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں آکر خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گزرا شیخوں والوں کے استاد حاجی علی نے ایک پٹھا تیار کیا۔ بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا مگر داؤں پیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں ایک دن جو میاں پَلی نے حسب معمول شیخوں والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اُتار اچیترا بدل سامنے آگیا۔ اور خم ٹھونک کر پنجہ ملانا چاہا۔ میاں پَلی کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا۔ استاد

خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک کر آتے اور کسی کو جواب میں ان کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے تخلص "بیل" رکھا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدانِ کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) علی جان نے کہا "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں بلاتے؟ یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے میں آکر خم نہ ٹھونکنا" کہنے لگے "استاد! جوڑ تو دیکھ لو۔ خواہ مخواہ لونڈے کو پسوانے سے حاصل؟" استاد نے کہا "میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھرے گا۔ دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا۔ یہی ہوگا نا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی اگر آئندہ کو کان ہو جائیں گے۔ بہر حال دونوں کے ہاتھ مل گئے۔ اور تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس مشاعرے کے دو چار ہی دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے۔ دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مگر اس روز وہاں تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں "بیل" کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی۔ پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگیے پہن، چادریں پھینک دنگل میں اُترے۔ اُترتے ہی دونوں نے "یا علی" نعرہ مارا۔ دو چار ڈھیکلیاں کھائیں کچھ پڑھ کر مٹی سینہ پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے آگئے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں "بیل" نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آگئے۔ وہ جھٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انھوں نے اس کا سیدھا ہاتھ پکڑ دسوبلی پاٹ پر کھینچنا چاہا۔ وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گا مڑ زوری کر کے اس کو دبا بیٹھے۔ لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں نکل

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے
ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اُس دبنگ سے

دل اُلجھے بے طرح سے پھنسا زلفِ یار میں
نکلے یہ کیونکہ دیکھئے قیدِ فرنگ سے

آجائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا
یاری تو تم نے کی ہے یَل اس شوخ و شنگ سے

ان کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا میرزا علی بیگ کے سامنے رکھدی: یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے۔ نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی، اُدھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی۔ "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً گہرے سُرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لے کر حاضر ہوا۔ نازنین نے بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا۔ ایک پلّو کا بُکّل مارا۔ دوسرا پلّو سامنے پھیلا لیا۔ اور خاصی کھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑلڑ کر اور اڑا اڑ کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲) نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اُس کو دبا ہی بیٹھے۔ وہ چپکا پڑا رہا۔ انھوں نے ہتھے کس لئے۔ تھوڑی دیر تک اس کو خوب رگڑا۔ وہ سہے چلا گیا۔ انھوں نے پہلو میں اُکس کر اس کا سینہ کھولنا چاہا۔ وہ بھی موقعہ تاک رہا تھا۔ یہ کھنچنے میں ذرا غافل ہوئے اس نے ٹانگ پر باندھ جو اُڑایا تو میاں "یل" چاروں خانے چت جا پڑے۔ لونڈا اُچک سینے پر سوار ہوگیا۔ وہ مارا۔ وہ مارا کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے دوڑ لونڈے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں یَل کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اُٹھ چادر اوڑھ منھ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے کیا گئے ہمیشہ کے لئے دہلی سے گئے۔ بڑے غیرتمند تھے۔ وہ دن اور آج کا دن۔ پھر ان کی صورت نظر نہ آئی۔ خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

قلعہ والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزا آیا۔ مگر جو ریختے کے اُستاد تھے وہ خاموش بیٹھے سُنتے رہے۔

ان کے پڑھنے کے بعد دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک غزل پڑھتا تھا اور پھر الٹی طرف کا۔

نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے۔ نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں اس مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا کہ سبحان اللہ لکھا ہے۔

فقط تو ہی نہ میرا اے بتِ خونخوار دشمن ہے

ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے۔ مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبداللہ خاں اوجؔ کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے پُرانے ۴۰، ۵۰ برس کے مشّاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں۔ لیکن ڈھونڈھ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعہ میں بھی ان کی سمائی مشکل ہے۔ اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزہ آئے۔ اور کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں، خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ دو دیں اگر صفِ مجلس سے گردوں آگے نکل جاتے

نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرے کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا

۱۴ رجب سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے مشاعرے میں شعراء کی نشست کا نقشہ

- نازنین
- اوج
- تصویر
- قلق
- کامل
- تجلی
- جوش
- یکتا
- تنویر
- جعفری
- ذوق
- احسان
- داغ
- صابر
- ظہیر
- حیا
- قناعت
- رفعت
- رسا

ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں۔ مگر استاد بھی ان کو استاد مانتے ہیں بھلا کس کا بل بوتہ ہے جو اُن کو استاد نہ کہہ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انھوں نے شعر پڑھا اُدھر اُستاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور اُن کے تیور بدلے۔ اُن کے غصے کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے۔ چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی۔ جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی۔

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا ۔۔۔ بے پلصراط اُتریں یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھکو وحشت سرا سے نفرت ۔۔۔ سُم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نال اپنا
کب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل ۔۔۔ سا کنچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
جیجک کے آبنوں کی ہیں باگ موڑتا ہوں ۔۔۔ (رکھ کے) دیوی کے آستاں پر پیپل اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اُچھل پڑے۔ کہنے لگے "واہ میاں آوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے۔ بھئی واللہ الفاظ "رکھ کے" کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں استاد کہتے ہیں میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا" غرض سب استادوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کُپّا ہوئے جاتے ہیں جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف "تمکین" کے سامنے آئی۔ ان کی عمر کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ مدرسۂ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے۔ بات کرنے میں منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ سانولا رنگ۔ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں۔ جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے۔
غزل کہی تھی۔

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا کس دل جلے کی یارخدایا یہ آہ تھی

خانہ خراب ہو جیو ترا عشق بے حیا آئین کونسا تھا یہ کیا رسم وراہ تھی

تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کردیا رہتا خدا اتھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی

تمکیں کو اک نگاہ میں دیوانہ کردیا جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی۔ قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا۔ اُستاد احسان نے کہا۔ "میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو۔ کوشش کئے جاؤ، ایک نہ ایک دن استاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ بے استاد رہے تو بھٹک نکلو گے۔" میاں تمکین نے مسکرا کر کہا۔ "استاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں۔ کل ہی انشاء اللہ استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں" استاد ذوق نے کہا۔ "ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔" یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ اُن کو میاں بتن بھی کہتے ہیں، الف کے نام بے نہیں جانتے۔ مگر طبیعت غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے۔ بعد میں اُن سے ٹوٹ کر استاد ذوق سے آملے۔ بھاری بدن، منڈی ہوئی داڑھی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ گہرا سانولا رنگ۔ جسم پر ڈوریے کا تنگ جہری کا پائجامہ، اوپر سوسی ہی کا کُرتہ۔ کندھے پر لٹھے کا رومال سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی۔ بچارے بخیہ بندی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پُرگو شاعر ہیں۔ لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں۔ اس لئے جو کچھ کہتے دل ودماغ میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں۔ اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا

پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے اُستادوں کے سر ہلجاتے ہیں۔ ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین مثال ہیں۔ غزل یہ تھی

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب — دن نہ آیا تو قیامت ہی سہی

جان بیکار تو اپنی نہ گئی! — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی

مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچئے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی

جذبۂ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ، واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو اُستاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا "خاں صاحب یہ میاں بتن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں۔ کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں۔ مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی، میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ ہاں میاں بتن وہ کیا شعر تھا۔ میاں بتن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل کر زبان پر آگیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آگئی — پہلو سے ڈلیں، دل سے کلیجہ میں جا لگی

اور شعر یہ تھا۔

دامن پہ وہ رکھے نہ کہے دلربا لگی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آگئی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا "میاں بتن! یہ خدا کی دین ہے۔ یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو۔ اس وقت دل خوش کر دیا"

ان کے بعد شمع محمد جعفر تابش کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے

ہیں۔ بہت دنوں سے دلّی میں آ رہے ہیں۔ بچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری سے دل لگاؤ ہے۔ کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے۔ وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے — توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں!
دل میں خوش ہیں عدو پر آتش — وہ ستمگر کسی کا یار نہیں!

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منھ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی۔ مفتی صدرالدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔ تالیث کے بعد اُلٹی جانب کی شمع میاں تلق کے آگے گئی۔ خدا اُن سے محفوظ رکھے۔ بڑے چالاک آدمی ہیں۔ عبدالعلی نام ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے۔ بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر بیڑا کر دیا۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں۔ مگر دل کا خدا مالک ہے۔ شعر خاصہ کہتے ہیں۔ لکھا تھا

جامِ شراب سے خمِ گردوں تو بن گیا — ساقی بنا دے ماہ پیالہ اُچھال کے
ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرو — جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اوج کے سامنے گئی۔ ان کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی۔ باقی تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اُس جانِ جاں کے دیر ہے — کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں — موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

۱ آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا اُلٹی جانب سے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ پہلے داہنی طرف کا ایک شعر پڑھا جاتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

اُن کے بعد مرزا کابل بیگ کی باری آئی۔ یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں۔ کابل تخلص کرتے ہیں۔ مشاعرے میں بھی اُوچی بن کر آئے ہیں۔ غزل اس طرح پڑھی گویا شطرنج کی کمان کر رہے ہیں۔ دیکھو تو مضمون میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے۔ ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا۔ وہی لکھتا ہوں۔

مژگاں سے گرید کیے دل، ادھر وہ کرے ہے ٹکڑے
یہ بات میں نے کہہ کر جب اُس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد نعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں۔ ۶۳ - ۶۴ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں، ایک جامع کمالات شخص ہیں۔ مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سنتے ہیں تو بے تاب ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں، دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر برا نہیں ہوتا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چمک اُٹھے۔ اور ہر شخص کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل جائے۔ آپ خود ہی ان کا کلام دیکھ لیجئے۔

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر	رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن	کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم!	ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی۔ اس لئے ذرا آزردہ سے ہو گئے۔ ان کے بعد شیخ میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں۔ بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔

پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے۔ مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں کیوں نہ ہو۔ آخر کس کے پوتے ہیں۔

مری وفا پہ تجھے وہ وہ شک تھا اے ظالم!
یہ سر یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سُنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔ میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھانند رقم کی باری آئی۔ اُن کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ مگر پڑھتے خوب ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی۔

بجھانا آتشِ دل کا بھی کچھ حقیقت ہے ذرا سا کام تجھے چشمِ تر نہیں آتا
عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے گیا اُدھر جو گزر پھر اِدھر نہیں آتا
ہو نا ک چارہ گری اس مریض کی تیرے نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا۔ اس کی انھوں نے بہت تعریف کی۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا "میاں رقم یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردانِ ذوق ذرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۹ سال کی ہے۔ مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے۔ مگر مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی

وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اُٹھا لیا۔ استاد ذوقؔ نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگردوں کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجئے، ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیوں کر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں

نصرت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب!
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں؛

قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں!
وہ زخم کون سا ہے کہ جو کارگر نہیں!

سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اُٹھ شراب پی
اے جوشؔ میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کرلی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

اُن کے بعد مولوی امام بخش صہبائیؔ کے بڑے فرزند محمد عبد العزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیزؔ تخلص کرتے ہیں، غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا	جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کم فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا	منصور گو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکا ہے سر	اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا

مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا

اوروں کے ساتھ لطف سے تعاملِ رنگیں یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہیے گا ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ اُستاد ذوق نے بھی کہا ! بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ ! کیا کہنا ہے۔ دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو۔ ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں ! میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ اُن کا کیا کہنا۔ سرکار سے خطاب خانی پایا ہے۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں، کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا۔ آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلوّن مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئے گا۔ میرا بڑا دل خوش ہوا۔ کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے جلے ہوں گے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اے آہِ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں نو آسماں ہیں، دو بھی نہیں چار بھی نہیں

ہے کس کو تابِ شکوۂ دشمن کہ ضعف سے لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں

جینا فراقِ یار میں وعدے کی آس پر آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی وہ شاعر ہے، یہ کون ہیں ؟ مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ میانہ قد کوئی ۳۰۔۳۲ برس کی عمر۔ بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے انہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے بند ہے مفتی صدر الدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب

ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بڑی پاٹ دار آواز ہے۔ پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُترتا جاتا ہے۔ ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں۔ ہر شعر قابلِ تعریف تھا۔ غزل یہ ہے۔

ایک دن، وہ دن، کہاں تک، تو کبھی تو انصاف کر
یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہوگیا!

ہے ترقی جوہرِ قابل ہی کے شایاں کہ میں
خاک کا پتلا بنا، پتلے سے انساں ہوگیا

کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بندِ نقاب!
اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہوگیا

پہلے دعوائے خدائی اُس بتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے "واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا۔ شعر کیا ہے اعجاز ہے۔ یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ کیا کیا کہا ہے۔ سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اُس بتِ کافر کو تھا۔ کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا" غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی۔ لوگ خود پڑھتے۔ ایک دوسرے کو سناتے مزے لے لے کر جھومتے۔ اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا۔ تو شمع نواب شمس خاں م تنویر کے سامنے گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ کوئی ۲۲-۲۳ برس کے ہوں گے بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ میاں شہرت کے شعر نے وہ

جوش پیدا کر دیا تھا کہ اُن کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سنی۔ غزل بھی معمولی تھی۔ صرف یہ قطعہ خاصہ تھا۔

جان کر دل میں مجھے اپنا مریضِ تپِ غم
کہتا لوگوں سے بظاہر بتِ عیار ہے کیا
رنگِ رُخ زرد ہے، تر چشم ہے، لب پر دمِ سرد
پوچھنا اُس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ متین اور وضعدار آدمی ہیں۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ اُن کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے۔

سبو سے منھ لگائیں گے اب اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھر یہ خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انھوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی، اس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آ گئیں
اللہ ری وسعتیں تری اے تنگنائے دل

جل جل کے آخرش تپشِ غم کے ہاتھ سے
اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل

دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا
اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر جس کا باپ شاعر

جس کا بھائی شاعر جس کا سارا خاندان شاعر۔ وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی۔ ملک الشعراء قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ غزل یہ تھی۔

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ
ناخدا ترس تو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ

بے سر و پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر
نازِ ہر گل نہ اٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہئے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دہلی سے اُٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ بھی اُس کو اب چھوڑتے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار نے شمع سامنے رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے کچھ آنکھیں کھولیں کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی۔ اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب نے کہا۔ "ضرور فرمائیے۔" اُنھوں نے نہایت آزادانہ لہجہ میں کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے، سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش!
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا۔ اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُٹھے۔ اور اسی عالم بیخودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ اُن کی "کچھ نہیں، کچھ نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی۔ اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجئے" شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد اُن کا کیا رنگ جمتا۔ اول تو یہ نوشق ہیں، مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں۔ دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے ادبت کا فر اُٹھا لیا — اس نازکی پہ بوجھ یہ کیوں کر اُٹھا لیا
بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھا لیا
پیرِ مغاں نے بسمل میکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

بہر حال کسی نے سنا کسی نے نہیں سنا۔ کچھ تھوڑی بہت دیر تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ ان کی کوئی ۴۰ برس کی عمر ہوگی۔ صہبائی کے شاگرد ہیں۔ مومن سے بھی اصلاح لی ہے۔ ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے۔ انہی کے دادا میر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، شعر بھی بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا۔

۱۔ ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل ۔۔۔ کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے

۲۔ شب وصال ہیں سننا پڑا فسانۂ غیر ۔۔۔ سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

۳۔ وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں ۔۔۔ نہیں ہے ضعف سے انتظار میں گزار مجھے

۴۔ میرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر ۔۔۔ نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے

مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکینؔ
کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔ اُستاد احسانؔ کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدلؔ کے سامنے شمع آئی۔ انھوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی، چشم کی، زلفِ دوتا کی ۔۔۔ ہے اک دل جفا کس کس بلا کی

کب اُس گل کی گلی تک جا سکے ہیں ۔۔۔ ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی

بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدلؔ ۔۔۔ تمہیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل ایسی ہی تھی۔ بھلا اس کی کون تعریف کرتا۔ ہاں اس کے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائبؔ نے پڑھی۔ اس میں مزا آگیا۔ میاں تائبؔ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں۔ اور نجم الشعراء نظام الدین ممنونؔ کے شاگرد۔ چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں

کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کتان دار جگر چاک ہوا　　پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا

کہئے اس بت کو مشابہ کس کے　　دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا

عہد پیری میں جوانی کی امنگ　　آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں نائب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے۔ جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع استاد ذوق کے استاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بچارے بڈھے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہیں۔ مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں استاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا استاد کہا کرتے ہیں۔ اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل جو پڑھی تو واقعی اُس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے پر!
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

استاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب۔ مومن، آزردہ۔ صہبائی۔ غرض جتنے استادان فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی۔ وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں۔ ذرا کسی نے واہ واہ کی اور انھوں نے استاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا، دیکھا شعر یوں کہتے ہیں: وہ بچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے۔ ان کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا۔ مگر انھوں نے روک دیا۔

خدا خدا کرکے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ اُن کا نام الگزنڈر ہیڈلے ہے۔ قوم کے فرانسیسی ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے یہیں تربیت پائی۔ اور یہیں سے توپ خانہ کے کپتان ہوکر الور گئے۔ کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے۔ ڈاکٹری بھی جانتے ہیں۔ شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ ظفر کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آموجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے۔ مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اردو میں ایسا شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرم رو راہ معاصی ہوں جہاں میں

گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا

کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی

ہاتھوں سے مراد دیکھ ذرا جیب دری کا

جہلم کو عیادت کے لئے وہ مرے آئے!

آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی بیچارے غریب صورت، فرسودہ لباس۔ کوئی ۶۵-۷۰ برس کے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے بڑے چاہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے جاتے تھے۔ اب بہت دنوں سے دُنیا سے کنارہ کشی کرکے قدم شریف جا رہے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُن کو دہلی کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے۔ اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔

ان کی غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیئے تھی ویسی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے۔ اور برے بھلے کی تمیز دشوار ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں۔ وہ بس ہوگئیں۔ نہ کسی نے شوق سے سنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شور نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے، قوم کے عیسائی ہیں۔ اور نام جارج پیس ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں ہاں، اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں، جو کچھ کہہ لیتے ہیں بہت غنیمت ہے۔ غزل

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا تزام لعیش
دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی!

بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا
ورنہ یہ زلیست مرگ کی اپنے گواہ تھی۔

دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا
جس طرف سر جھکا وہی بس سجدہ گاہ تھی

ان کے بعد محمد عسکری نالاں کی باری آئی۔ بھلا اس نوے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی یاد آدم کے وقت کے کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے
شبِ وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے

وہ بدگماں ہوں کہ اس بت کے سایہ پر بھی مجھے
رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے!

میاں نالاں نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی
شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں
مل ڈالیں بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑیں۔ بعض اُٹھ اور پانی کا
چھپکا منھ پر مار آ بیٹھے۔ کیسی نیند اور کہاں کا سونا۔ میر صاحب کے نام نے
سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے۔ انھوں
نے بھی پہلو بدلا۔ استادانِ فن کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ نوجوانوں میں
سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا
فخرو نے کہا "میر صاحب یہ ٹھیک نہیں۔ آپ تو بیچ میں آکر بڑھئے"۔ یہ
کہہ کر چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دو شمعیں اٹھا، وسط صحن میں رکھدیں
میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے۔ بھلا
دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا۔ کونسا مشاعرہ ہے جو اُن
کی وجہ سے چمک نہیں اُٹھتا، کونسی محفل ہے جہاں اُن کے قدم کی برکت
سے رونق نہیں آ جاتی۔ ان کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں۔
ہم نے تو جب سنا اُن کا نام میر صاحب ہی سنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے۔
بڑے سوکھے سے آدمی ہیں۔ غلافی آنکھیں۔ طوطے کی چونچ جیسی ناک بڑا
دہانہ، لمبی ڈاڑھی، بٹیا سا سر خشخاشی بال۔ گوری رنگت۔ اونچا قد۔
غرض اُن کے حلیے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھئے تو پورا پورا پتہ دے۔
نہایت صاف ستھرا لباس۔ سفید ایک برکا پاجامہ۔ سفید کرتہ۔ اس پر
سفید انگرکھا۔ سر پر پرا دھجین (عزت جین) ٹوپی، چہرے پر متانت بلا کی
تھی۔ مگر جب غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا
بڑا، کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا۔ اور یہ بھی "ڑے" سے وہ جواب

دیتے تھے۔ کہ منھ پھر جائے اس سے ان کو غرض نہ تھی۔ کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں تمکین سے لے کر بادشاہ سلامت تک۔ اُن کو چھیڑتے تھے۔ انھوں نے نہ اِن کا بُرا مانا نہ اُن کا۔ جواب دینے میں نہ اِن سے رُکے نہ اُن سے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہ پڑھتے تھے۔ لکھکر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لا شعر کو ختم کر دیا۔ انھوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ یہ بھلا کب دبنے والی آسامی ہیں۔ چوطرفہ لڑتے۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے اُن کو بٹھا دیا۔ معترض کو ڈانٹا۔ میر صاحب کا دل بڑھایا۔ اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو اُن سے اُلجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے۔ کہ اگر اُن کا کوئی شاگرد سُن لیتا تو دور سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب[1] نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی

---

[1] غدر کے بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اسمیں بھی یہ شریک ہوتے تھے۔ اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں۔ انہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کئے گئے۔ تذکروں میں تو اُن بیچارے کا کیوں ذکر آنے لگا۔

اور کہا "حضرات میں آج میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں۔ اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔"

میاں ہدہد سے سب جلے بیٹھے تھے۔ اب جو سنا کہ انکی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے، سب نے کہا، "ہاں میر صاحب ضرور فرمائیے۔" میاں ہدہد حکیم آغا جان عیش کے پٹھو تھے۔ اور انہی کے بل پر پھُدکتے تھے۔ اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہدہد کی ہجو پر اُتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں۔ دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے۔ بھلا میر صاحب کی بحرِ طویل کا کون جواب دے سکتا ہے۔ اور تو کچھ بن نہ پڑا۔ میاں ہدہد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب اِدھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا ــــــ جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں۔" سب نے کہا "ہیں! میر صاحب یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا۔ پڑھئے میر صاحب! خدا کے لئے پڑھئے۔ سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اُٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائے گا۔ زبان ادھوری رہ جائے گی۔" میر صاحب نے کہا "نا بھئی نا میاں، ہدہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا اُن کے منہ پر کہتے۔ اُنکے پیٹھ پیچھے ــــــ ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں، غیبت ہے۔ اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ انھوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی۔ کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے بس اتنا معلوم ہوا کہ تیر، پیر، کھیر قافیہ، "اور تھے ہے" ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا، خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انھوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا "اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحرِ طویل میں جا پڑا"۔ میر صاحب نے کہا "مولوی صاحب کبھی بحرِ طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول[1] پڑھئے۔ مطول جب معلوم ہو گا کہ بحرِ طویل کس کو کہتے ہیں"۔ مولوی صاحب بڑے چکرائے۔ کہنے لگے "میر صاحب! بھلا مطول کو بحرِ طویل سے کیا واسطہ۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں"۔ میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا "مولوی صاحب! مطول میں بحرِ طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں"۔ بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے "جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھے ہوں گے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اس کے دو دور کرتا ہوں۔ کل ہی اس کی بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے

---

[1] علم معانی و بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

تک گیا۔ ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحے میں لکھا۔ وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرعہ ختم ہوا۔ ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔" مرزا نوشہ نے کہا "میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو۔ اس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے۔ یہ بڑی بڑی اور یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں۔ بحرِ طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحرِ طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے۔" میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور بگڑ کر کہا "واہ مرزا صاحب سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں۔ بھلا بتائیے تو سہی کونسی کتاب میں ہیں؟" یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین[1] پڑھئے۔ جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کونسی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرہ کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے۔ اور سب لوگ تازہ دم ابھی آ کر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا "حضرات! غزل ختم ہوئی۔" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں۔ بے مقطع کی یہ کیسی غزل؟" میر صاحب نے فرمایا "مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو

[1] اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے تعلق کر دیا۔

بتانا پڑتا ہے کہ یہ غزل میری ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہوگیا کہ یہ میر کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی"! یہ کہتے کہتے انھوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ناہر کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی۔ لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ! قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہوگیا

ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہوگیا

اے ہمنشیں وہ حضرت ناہر نہ ہوں کہیں اک پارسا سنا ہے کہ مے خوار ہوگیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اُتار دیا تھا۔ اس لئے اس غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف ہوئی۔ اور میاں ناہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔ ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی۔ یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۲۰۔ ۲۲ برس کی عمر ہے۔ سر پر لمبے لمبے بال۔ سانولی رنگت۔ اس میں سبزی جھلکتی ہوئی۔ اونچا قد۔ وجیہہ صورت، سفید غرارہ دار پجامہ۔ سفید انگرکھا۔ دو پلڑی ٹوپی۔ بڑے خوش مزاج شیریں کلام ہنس مکھ۔ بذلہ سنج۔ وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے۔ پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے۔ آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ، واہ۔ کہتے ہیں:۔

بزم اغیار رہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے

ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے
ورنہ تو پردہ اُٹھا دے تو، تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزا ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا!
چاہتا ہوں یونہی ہر روز خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں، وصل سے میں درگذرا
کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے
ہو نہ ہو، بس میں کوئی، کچھ نہیں اسکی پروا:
دلِ بیتاب پہ اے برقؔ جو قابو ہو جائے

اللہ، اللہ! در و دیوار سے بیخودی برس رہی تھی۔ جب یہ مصرعہ پڑھا گیا "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی۔ اور تو اور استادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے۔

ابھی اُن کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ فسوں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظلِ سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا، زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر غزل پڑھتے ہیں۔ پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ انکی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دلِ مضطر کہ تیر کا
باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا کھنچا جائے ہے
ظاہر میں تو الہٰی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں نگینے جڑ دیے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو قلعہ کے رہنے والے ہیں۔ اُن کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰۔ ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ۔ اس پر سفید لباس۔ بغل میں انگوچھ۔ کندھوں پر سفید کشمیری رومال۔ بس جی چاہتا تھا کہ اُن کو دیکھے ہی جایئے۔ شمع سامنے آئی۔ تو انھوں نے عذر کیا کہ میں اب سُنانے کے قابل نہیں رہا۔ سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انھوں نے یہ قطعہ پڑھا۔

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت جو اُٹھ کھینچیں دامن، ہم اُس دل ربا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ "نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے۔ مگر پاؤں نے یاری نہ کی۔ لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہہ کر ہاتھ اُٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی اُٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منھ سے تعریف کے بجائے بیساختہ یہی نکل گیا کہ "اللہ والی ہے بے دست و پا کا"۔ اُستاد ذوق نے کہا "اُستاد! یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے۔ سبحان اللہ! کیا مؤثر کلام ہے۔ ہم دنیا داروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لئے میر درد ہی جیسا اُستاد چاہیئے"۔

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون سنتا۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ اونچا قد، سفید پوش ثقہ صورت آدمی ہیں۔ پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا۔

کچھ وجہ نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف
کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر بت اشکی
معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی۔ ۳۰-۳۲ کا سن ہوگا۔ رام پور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ انہی کے ساتھ مشاعرہ میں آ گئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی، مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میخانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ! ہائے لکھا ہے۔

معمور ہے خدا کی عنایت سے مے کدہ!
ساقی اگر نہیں ہے، نہ ہو اس سے کام ہے
بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیئے ہیں ہاتھ
یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخر الدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا۔ نہ کلام ہی اچھا، نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر اُن کو روک کون سکتا تھا

شہزادے تھے۔ اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ غیر پڑھ لیا۔ اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں۔ خوش ہو گئے۔ غزل یہ تھی۔

ترے بیمارِ ہجراں کا ترے بن — یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے

مجھے روتے جو دیکھا ہنسکے بولے — مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں اُن کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان ہیں۔ مگر شاعر ہے اور ایسا شاعر ہو گا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی۔ اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرے میں گیا ہے وہ اُن کو دُور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا سا قد۔ دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ موٹی جلد۔ گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ۔ چھدری چھوٹی سی ڈاڑھی۔ کلوں پر کم۔ ٹھوڑی پر ذرا زیادہ۔ سر پر خشخاشی بال۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مہری کا پائجامہ۔ سر پر سفید گول ٹوپی۔ ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال۔ شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی انگرکھے کی آستین اُلٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے؟" مرزا فخرو نے کہا "ہاں میاں سالک پڑھو۔ آخر انھیں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے؟" سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا۔ کچھ اُلٹا، پلٹا۔ پھر ایک بار سنبھل کر کہا۔ عرض کیا ہے۔

انتہا صبر آزمائی کی! — ہے درازی شب جدائی کی

ہے برائی نصیب کی کہ مجھے
تم سے امید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے
داستاں اپنی جبہ سائی کی

ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں
پھر شکایت ہے نارسائی کی

کیا نہ کرتا وصال شادی مرگ
تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی

راز کھلتے گئے مرے سب پر
جس قدر اُس نے خود نمائی کی

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں
بندے بندے میں تُو خدائی کی

رہ گئیں دل میں حسرتیں سالکؔ
آگئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتی ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد ملتی۔ اُستاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا "واہ میاں سالک کیا کہنا ہے۔ سب ہی جبہ سائی باندھتے آئے ہیں۔ تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا۔ کیا کلام ہے۔ کیا روانی ہے۔ سبحان اللہ۔ حکیم مومن خاں نے کہا "میاں سالک! یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون۔ تمہاری "عمر پارسائی" کو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے تو بڈھوں کی سی باتیں نہ کیا کرو" میاں سالک نے جواب دیا "استاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہوگیا۔ دیکھئے بڑھاپا دیکھنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں۔ بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا۔ کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے۔ ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا"!

جب تعریفوں کا سلسلہ دراز کا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴-۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں، مگر پھیکے۔ ہاں

پڑھتے بڑی اچھی طرح. گانا خوب جانتے ہیں۔ اُن کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بت خانے میں تھا یا کہ میں کعبہ کے قریں تھا
اے زاہدِ ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا

ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا
پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا

توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں!
ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا. ہاں اُن کے گانے میں مزا آگیا۔ گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے۔ مگر اُستادانِ فن اس کو پسند نہیں کرتے۔
ان کے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائی کے سامنے آئی۔ انھوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سنائی۔ علائی مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں۔ ابھی نوعمر ہیں۔ شعر اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، کس کے شاگرد ہیں۔ غزل دیکھ لو اُستاد کا رنگ غالب ہے۔

آوارگانِ گلکدۂ آرزو۔ آرزو! — حاشا اگر تمہیں سرِ سیرِ فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشمِ دل — کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدحِ موج خیز رنگ — وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
گل جو رگل ہے سنگِ جفائے سپہر سے — گویا کہ غمکدہ کا شکستہ ایاغ ہے
اور لالہ تند بادِ حوادث سے خاک خوں — گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز! — اُس جا پہ آج دل شکن آوازِ زاغ ہے
مغرورِ جاہ سے یہ کہو تم علائیا — کل ایک سطحِ خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا نبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی۔ مگر ساری کی ساری بے مزا۔ نہ الفاظ کی بندش اچھی۔ نہ مضامین میں کوئی خوبی۔ تعقیدوں سے اُلجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھدینا کافی سمجھتا ہوں۔

بازآ، ستا تو مجھ کو بہت عشوہ گر نہیں
کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں

گو نزع میں ہوں میں تسے بن آجائیے
کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاءالدین خاں نیّر، درخشاں کے پڑھنے کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں۔ اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا۔

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں　　ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر　　گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
دل میں مضمر ہیں معنیٔ باقی　　کسی صورت نہیں زوال ہمیں
ترے غصے نے ایک دم میں کیا　　مُردۂ صد ہزار سال ہمیں
طالع بد سے نیّر رخشاں　　اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ بٹیریں لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پہلے احسان کے شاگرد تھے۔ اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ لکھا تھا۔

بسانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت سے
کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا

نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے گرہم
یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا

گندھی تھی کونسے بدست تشنہ لب کی وہ خاک
کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا

بہ ذوق ناز کو دے رخصت جفا کہ یہاں
ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا

ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جن کو راز و نیاز
اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منھ زبانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ کر نہ جھومتا ہو۔ اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا اُن کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد۔ اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی۔

اُٹھتا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں — پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اُس کا گھر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے سے ڈر نہیں — خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں — اپنے ہی جبکہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی۔ اُستاد احسان نے کہا "میاں عارف ہیں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں۔ لاکھوں شعر سنے لاکھوں سنائے مگر

یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا"
میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیرالدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے ہیں۔ احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہے
حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ
دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے

جنسِ دزدیدہ کے مانند ہے الجھاؤ میں جان
کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے

رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور، کہ یاں
کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیورِ علم سے آراستہ اور لباسِ کمال سے پیراستہ، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج شیریں کلام شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ۔ میانہ قد۔ خوش اندام۔ سر پر ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی۔ اس گوری سُرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے ان کے دوست

بھی اُن سے ذرا کھنچ گئے ہیں۔ میاں ہُدہُد کو پال کر انھوں نے سب سے بگاڑ لی۔ شروع شروع تو اس کی واہی تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا، لیکن جب اُس نے استادوں پر حملے شروع کئے۔ اس وقت سے ہدہد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہو گئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انھوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مملوک العلی نے کہا: "حکیم صاحب، شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو اُن کے شعر سمجھتے ہیں، پھر اپنے ساتھ ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا؟" مومن خاں نے کہا "بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی شاعرانہ تعلی معلوم ہوتی ہے۔" بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔

اس معرکہ کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب نے ہدہد کے مقابلے میں جو اعلانِ جنگ کیا تھا وہ سُن چکے تھے۔ اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی۔

رنج اُن سے ہمیں سہے ہی بنی
دل پہ جھگڑا تھا دل دیے ہی بنی
زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے
ہاتھ سے اُس کے مے پیے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار
پاس اپنے بٹھا لئے ہی بنی
کس کا تھا پاسِ شوقِ ظلم اے عیش!
اُن جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صل علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبارِ کدورت دور کر دیا۔ اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے تھے۔ نہ اُن سے کسی کو رنج رہا اور نہ اُن کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہُدہُد کچھ چوک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا انھوں نے پہلے ہی اس بکھیڑ کی زبان بندی کر دی۔ خیر رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیا کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی ان کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسا نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بذلہ گو اور ظریف آدمی ہیں۔ کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے۔ اکثر بنارس میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر ڈاڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا سا۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے۔ پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ اب اپنا کلام اُستاد ذوق کو دکھاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں۔ پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی۔ اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں۔ مگر محنت نہیں کرتے۔ زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے ۔۔۔ رنج مرنے کا مجھکو راحت ہے

ہو چکا وصل، وقتِ رخصت ہے ۔۔۔ اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا ۔۔۔ ظلم کرنا تمہاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش — ہر نفس بانگِ کوسِ رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے — دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ — آج اُس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر اُن کے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی۔ سانس کو مؤنث باندھ گئے" حیا نے جواب دیا "جی نہیں قبلہ میں نے تو اُستاد ذوق کی تقلید کی ہے، وہ فرماتے ہیں "سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد" بھلا صاحب عالم[1] کب چوکنے والے تھے، کہنے لگے، بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے، وہ جو چاہیں لکھیں۔ یہ بتاؤ قلعے میں سانس مذکر ہے یا مؤنث" بچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکہ تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں، ہزاروں شاگرد ہیں، اکثر ریختہ کہتے ہیں۔ ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں۔ مگر خود اُن کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سنی۔ اس مشاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم — محرمِ خونریزی نگشتم با خساں کم ساختم

مردم و در چشمِ مردم عالمے تاریک گشت — زانکہ شمعِ سحر رفتم بزم برہم ساختم

کفر و دین چشمِ سپاسِ نعمتِ دیدارِ اوست — جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم

[1] قلعہ والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا تھا۔

جرم عشقم را جزا شد خوردن زہر دو دست ‏ داغ بر دل بُردم و خلد بہشت جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباد ‏ مے ز خونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے منہ دیکھا کئے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے کبھی پسند نہ آیا۔

اہا ہا ہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیر کو سنئے۔ ابھی ۳۰ - ۳۲ سال کی عمر ہے۔ مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ۔ استاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے شکل صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی طبیعت اس بلا کی ہے، قد خاصہ اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت۔ کشادہ دہن۔ اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔ مگر روشن۔ گول ڈاڑھی، نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری۔ سر پر پٹھے، لباس میں انگرکھا۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ۔ سر پر سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں، اور شوق اسکے آستاں کا ‏ ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا ‏ خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے ‏ سراغِ نقشِ پا ہوں کارواں کا
اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے! ‏ غضب ہے بارِ منت پاسباں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں ‏ مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا

دلِ بیتاب نے وہ بھی مٹایا ۔۔۔ کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا
ظہیر آؤ چلو اب میکدے کو ۔۔۔ نکالا زہد و تقوی ہے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دکھ گئے ہوں گے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا۔ یہ استادانِ فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں۔ مگر خود استاد ہیں۔ انھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی۔ یہ سنکر ذرا خاموش ہوئے۔ اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں ۔۔۔ گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اسمیں محو اور یہ سب سے علاحدہ ۔۔۔ آئینہ میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں
معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول ۔۔۔ کیا فائدہ ہے، موج اگر ہے سراب میں
ذات و صفات میں بھی بہی ربط چاہیئے ۔۔۔ جوں آفتاب روشنیِ آفتاب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا ۔۔۔ وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
بیباک شیوہ، شوخ طبیعت زباں دراز ۔۔۔ ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو، مگر حضور ۔۔۔ اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

؟

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کرسکے۔ مگر تعریف
بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ
نومشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھتے ہیں۔ مگر جب استادوں
کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے
بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ اُستادوں کے انھیں شعروں کی تعریف
ہوتی ہے جو واقعی قابلِ تعریف ہوں۔ اگر کسی شعر کی ذرا بیجا تعریف
کردی جائے تو اس سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی
تعریف چاہتے ہیں جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہیے
شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف۔ اور وہی داد
بھی دیتے ہیں۔ مشاعرے کے باقی لوگ اُن کے کلام سے لطف ہی نہیں
اُٹھاتے کچھ حاصل بھی کرلیتے ہیں۔ اور ان کے لئے یہ غزلیں استاد کی
اصلاح سے کم فائدہ مند نہیں ہوتیں۔ اُن کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش
صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی ۴۰ برس کے ہوں گے۔ اُن کی شاعری کی
قلعہ میں بڑی دھوم ہے۔ خود اُن کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔ شعرائے
دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لے کر یے
تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ خدا بہتر جانتا ہے۔
اُنھوں نے اپنے حالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں وہ نقل کرتا ہوں۔

قطعہ

پہلے استاد تھے احسان و نصیر و ممنون — ہوئی احساں سے بہ اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض — طبع باریک ہوئی انکی بدولت میری
اب ہم بزم ہے مومن و ذوق و غالب — اوستادوں ہی سے ہر دم ہی صحبت میری

ہند کا فضل و ہنر ذات پہ ہے جنکی تمام — مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم اشعار — کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر ان کو استاد کہو یا جو جی چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے۔ مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں۔ مگر سارا شہر اُن کو استاد مانتا ہے۔ ہوں گے، ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی

نظارہ برقِ حسن کا دشوار ہو گیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہو گیا
محفل میں، میں تو اس لب میگوں کے سامنے — نام شراب لے کے گنہگار ہو گیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہ رخ یار ہو گیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی — عاصی گنہ نہ کر کے گنہگار ہو گیا
اُسکی گلی میں آ کے کیا کیا اُٹھائے رنج — خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب — قامت خمید ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔ اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے، اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ اُن کے تلامذہ شاعر ہیں۔ اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں۔ مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز بھی ذرا نیچی ہے لیکن اُن کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے۔ اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں ہاں مرزا نوشہ اُن سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔ کیا پختہ کلام ہے

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

شب اُس کو حالِ دل نے جتایا کچھ اس طرح
ہیں لب تو کیا، نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق!
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں!

کہتا ہوں اس سے کچھ میں، نکلتا ہی منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں!

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا۔ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو اُستادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہو گئے۔ ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب

ہو گی، ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجیے۔ اور داد دیجیے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں | ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن | لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی | شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں | وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیے میکشوں سے لطفِ شراب | یہ مزا پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک | وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہوں | لطفِ عمر دراز کیا جانیں
جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے | آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ، اللہ، وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دل کش سُر، وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھولی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہو گیا ہو۔ اور کوئی نہ تھا جس کے منہ سے جز اک اللہ، سبحان اللہ اور صلِّ علیٰ کے الفاظ بے اختیار نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا۔ اور اس ریختے کے اُستاد کے کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انھوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے بڑھے اور سنبھل کر بیٹھے۔ بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی۔ ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا۔

آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کیساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ!
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کیساتھ

اُس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغ خلد ہے!
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی، بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے، وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اُس کو پڑھتے وقت اُن کی انگلیاں زیادہ تیزی

سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو انگلیوں میں بل دے کر مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیئے پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے، اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر وبم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سنکر مسکرائے اور کہا "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

اُن کے بعد شمع اُستاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ انکی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو بجلی سی بدل کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر اُستاد ذوق کو۔ ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پر ایسی چھائی تھی کہ جس کو انھوں نے متوجہ کیا، اس کو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا۔ مگر ان کی اُستادی کی داد دینی چاہیئے کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دلِ محزوں
نہ رو، نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رُلائے خدا
بتو! بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دو گے جواب
خدا کے بندوں پہ یہ ظلم، بندہ ہائے خدا

رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف
جو اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو، رضائے خدا

بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان
یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی۔ شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہہ کر ایسے دل کش اور موثر لہجہ میں غزل پڑھی کہ ساری محفل سرد ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پُر درد تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدر دان نہیں پاتے اور اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں! — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا۔ اب اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر اُنسے خدا سمجھے! حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے "مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے"۔ غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا۔ اور شمع اُستاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا "صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں۔ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہیں آتی تھی۔ لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی۔ شب ہجر کا مزا آگیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہو گیا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ مرزا فخرو نے کہا "اُستاد! آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے۔ غزل پڑھیے۔ رباعی پڑھیے۔ قصیدہ پڑھیے۔ قطعہ پڑھیے۔ غزل جو دل چاہے پڑھیے۔ ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور"۔ اُستاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اُٹھی۔ اور اُن کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر ۔۔۔ کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
شبِ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر ۔۔۔ مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم ۔۔۔ اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے ۔۔۔ کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے ۔۔۔ مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم ۔۔۔ ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج ۔۔۔ پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے

حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
تری سینہ زنی کا شور سنکر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے!
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے!
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوع صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقین ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یاسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے اذان آئی۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے منہ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے"۔ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا "صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے" یہ کہہ کر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر ان کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی حضرات

دلی کا آخری مشاعرہ ختم ہوا

نقیبوں کی ایک اور آواز

سُن رے سُن او حسن نظامی آخری بادشاہ کے آخری ولی عہد مرزا فتح الملک عرف مرزا فخرو نے دلّی کے آخری مشاعرے کی شمع بجھائی اور نقیبوں سے کہا کہہ دو دلّی کا آخری مشاعرہ ختم ہوا۔ یہ کہنا سچ بھی تھا کہ آخر سب کو فنا ہے باقی رہنے والی تو بس اُس ذات پاک کی روشنی ہے جس نے نور اور ظلمت کو پیدا کیا تھا۔ مگر ذرا سُن تو سہی نقیبوں کی کچھ اور آوازیں بھی آرہی ہیں۔ کہ دلّی میں پھر اردو زبان کے ایوان میں مشاعرے کی شمع روشن ہوئی ہے۔ شعرا قدیم کی روحیں سبز قندیلوں میں بیٹھی اعلیٰ علیین سے اُتری چلی آرہی ہیں۔ نئے زمانے کے شاعر قدیمی لباس سے آزاد ڈاڑھی مونچھ منڈائے انگریزی مانگ نکالے مُنہ میں سگرٹ دبائے چاروں طرف سے چلے آرہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ فرحت اللہ بیگ فرحت دہلوی نے دلّی کے آخری مشاعرے کی بہار کٹھ پتلی کے تماشے میں دکھا کر سب کو غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ روتا ہوا دلّی شہر پھر ہنسے۔ بُجھا ہوا چراغ پھر روشن ہو۔ اُجڑی ہوئی سُنسان محفل پھر آراستہ ہو۔

یہ مٹیا محل ہے دلّی کی جامع مسجد کے جنوب میں اور ہم سب نواب خواجہ محمد شفیع کی اُردو مجلس کے مکان میں مشاعرے کی نئی شمع روشن کرنے آئے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتاب چھپتی جاتی ہے۔ بکتی جاتی ہے ختم ہو جاتی ہے پھر لکھی جاتی ہے پھر چھپ جاتی ہے پھر پنجاب والے اس کو ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں کیونکہ دلّی کے آخری سیّد نے اُن کو زندہ دل کہا تھا اور وہ ہر بات میں اور ہر کام میں زندہ دلی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔

دلّی اور لکھنؤ کو بہت بڑا غرہ اس کا تھا کہ اہل زبان ہم ہیں۔ اُردو شاہجہاں آباد سے نکلی تھی یا شہنشاہ شاہجہاں کے اُردو (لشکر) نے اس کو اپنی گود میں پالا تھا۔ مگر کہتے سب کچھ ہیں کرتے کچھ بھی نہیں یہ حصہ تو فقط پنجاب کا ہے جو اردو زبان کو زمین سے آسمان تک پہنچا رہا ہے۔

حسن نظامی سنتا بھی ہے۔ دیکھتا بھی ہے سُناتا بھی ہے دکھاتا بھی ہے لیکن اُس کو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلی کی یاد نے اتنا غمزدہ کیا ہے کہ لوگوں کو ہنستا ہوا دیکھتا ہے۔ تب بھی اُس کی آنکھ کا آنسو نہیں تھمتا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے دلّی چھوڑی حیدر آباد کو گھر بنا لیا اُس اجڑے دیار میں جو چند ہندو مسلمان اتوار کے اتوار اُردو مجلس میں سر جوڑ کر بیٹھ جایا کریں تو اس سے یہ سمجھ لینا خام خیالی ہے کہ شمع پھر روشن ہو گئی ہے اور بیچ بیچ نقیبوں کی نئی آواز آ رہی ہے۔ کیونکہ دلّی میں بیس سینما گھر ہیں اور ہر سینما گھر میں اتنے زیادہ ہندو مسلمانوں کی بھیڑ ہوتی ہے کہ اُردو مجلس کے حاضرین کی تعداد اُس بھیڑ کے سامنے نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی اگر نئے مشاعرے کے نقیب کہتے ہیں کہ حسن نظامی رومال سے آنسو پونچھے اور ذرا ہنسے تو میں آنسو پونچھ لیتا ہوں اور ہنسنے کی کوشش بھی کرتا ہوں اور اپنے پاش پاش دل کے ٹکڑوں کو جوڑنا بھی شروع کر دیتا ہوں۔ کیونکہ سنتا آیا ہوں کہ ہنستے ہی گھر بستے ہیں شاید دلّی کی ختم شدہ بزم شاعری پھر نمودار ہو جائے۔

دائیں طرف دیکھتا ہوں اور پوچھتا ہوں بھائیو! آنکھوں سے کم نظر آتا ہے۔ ادھر دلّی والے کتنے بیٹھے ہیں جواب ملتا ہے نشست تو پچاس کی ہے مگر دلّی والے پانچ ہیں۔ بائیں طرف پوچھتا ہوں سامنے والوں سے پوچھتا ہوں۔ ہر طرف سے یہی جواب ملتا ہے۔ شب بخیر دلّی والوں نے پھانسیاں پائیں یا جلا وطن ہو کے جنگلوں ویرانوں میں دھونی رمائی۔ اب یہاں دُور دُور کے لوگ آئے ہیں اور اپنے اپنے رواج اور دستور کے ڈیرے خیمے لگائے ہیں۔ بچاری جامع مسجد کے مینار چُپ چاپ کھڑے دُنیا کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اور کسی شاعر کے یہ اشعار پڑھ رہے ہیں۔

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفۂ گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
ذاتِ معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

صبحدم طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

دل فگار
حسن نظامی
۱۹ر اپریل ۱۹۴۵ء عیسوی
دھلی

خواجہ حسن نظامی کی ایک آنہ اردو یونیورسٹی دہلی

اردو زبان کو علمی بنانے کے لئے

اور گھر پہنچانے کے لئے

ایک آنے۔ دو آنے۔ چار آنے۔ آٹھ آنے۔ بارہ آنے۔ ایک روپے قیمت کی کتابیں شایع کرتی ہے
ایک آنے سے کم اور ایک روپے سے زیادہ قیمت کی کوئی کتاب نہیں ہوتی

ہر کتاب مجلد ہوتی ہے

ایک آنے والی کتاب کے صفحات ۱۶۔ دو آنے کے ۳۲۔ چار آنے کے ۶۴۔ آٹھ آنے کے ۱۲۸۔ بارہ آنے کے ۱۹۲۔ ایک روپے والی کے ۲۵۶

ہر علم و فن کی کتابیں آسان زبان میں تیار کی جاتی ہیں۔ قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے۔ اس لئے کمیشن پر کسی کو نہیں دی جاتیں۔ تاجروں کی اردو کتابوں اور اخباروں کے اشتہار پانچ روپے صفحہ اجرت پر لئے جاتے ہیں۔ ایک صفحہ سے کم یا زیادہ کا اشتہار کسی کا نہیں لیا جاتا
اس کاروبار کے مالک بلا شرکت غیر خواجہ حسن نظامی ہیں
معاملات کی خط و کتابت منیجر ایک آنہ اردو یونیورسٹی دہلی سے کی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب سے نہیں۔